بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ | ۲۵ر اکتوبر ۲۰۲۶ء مطابق ۱۷ر جمادی الاول ۱۴۴۸ھ | شمارہ نمبر ۲۴

اس شمارے میں

شعروادب	مولانا محمد ولی رازیؒ، مولانا محمد ثانی حسنیؒ	۴
شمع بجھ کر رہ گئی...	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۵
نفاقِ عملی اور چند اہم باتیں	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۶
اللہ کی بندگی یا مال واسباب کی غلامی	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۸
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۹
ہندوستان کی جمہوری وسیکولر شناخت	انیس احمد ندوی	۱۰
تعمیرِ شعور-فکری بیداری کا آغاز	محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی	۱۳
سیرتِ نبویؐ پر مستشرقین کے اعتراضات	محمد فرمان ندوی	۱۶
مسلم نوجوانوں کے مسائل اور حل	محمد معاذ ندوی	۱۹
مسلم تہذیب کے عروج وزوال کا اثر	ڈاکٹر محمد عابد کریم	۲۲
علم کی عظمت اور اُمت کی فکری تعمیر	ڈاکٹر سہیل ندوی	۲۵
خاندانی منصوبہ بندی: ایک جائزہ	رحمت اللہ سعد ندوی	۲۷
جسم کی فکر، روح سے غفلت	محمد جاوید اختر ندوی	۲۹
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۱
دوروزہ مشاورتی اجلاس مدارس ملحقہ	محمد نفیس خان ندوی	۳۲

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30 جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر و ادب

مداوائے دردِ دل

نتیجۂ فکر:۔ مولانا محمد ولی رازیؒ

ہر دم درود سرورِ عالم کہا کروں
ہر لحہ روئے مکرم رہا کروں

اسمِ رسول ہوگا، مداوائے دردِ دل
صلِّ علیٰ سے دل کے دکھوں کی دوا کروں

ہر سطر اس کی اسوۂ ہادی کی ہو گواہ
اس طرح حالِ احمدِ مرسل کہا کروں

معمور اس کو کرکے معرا سطور سے
ہر کلمہ اس کا دل کے لہو سے لکھا کروں

گو مرحلہ گراں ہے، مگر ہو رہے گا طے
اسم رسول سے ہی دردِ دل کو وا کروں

ہر دم رواں ہو دل سے درودوں کا سلسلہ
طے اس طرح سے راہ کا ہر مرحلہ کروں

دے دوں اگر رسول مکرم کا واسطہ
دل کی ہر اِک مراد ملے، گر دعا کروں

اس کے علاوہ سارے سہاروں سے ٹوٹ کر
اللہ کے کرم کے سہارے رہا کروں

ہوکر رہے گا سہل، ہر اک مرحلہ کڑا
اللہ کے کرم کا اگر آسرا کروں

اردو کو اِک رسالہ الہام دوں ولیؔ
لوگوں کو دورِ ہادی عالم عطا کروں

انجام سے تو ظالم شاید کہ بے خبر ہے

نتیجۂ فکر:۔ مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ

آتا ہے یاد ہم کو رہ رہ کے وہ زمانہ
مامون آفتوں سے تھا جب کہ آشیانا

آباد تھا چمن جب بے خار تھا نشیمن
اہلِ چمن تھے گاتے خوشیوں کا جب ترانا

ہائے چمن کو ظالم صیاد نے اُجاڑا
کانٹوں سے بھر دیا ہے پھولوں کا آشیانا

آباد جو چمن تھا ویران ہوگیا ہے
مرغِ چمن بنا ہے صیاد کا نشانا

اپنے چمن میں ایسے بیگانے بن گئے ہم
سارا جہاں پرایا اپنا نہیں زمانا

معمور جن کے دل تھے اہل چمن کے غم سے
افسوس ہوچکے وہ سوئے عدم روانہ

ہے آج حد بھی کوئی غربت کی، بے کسی کی
اپنا چمن ہے لیکن پھر بھی نہیں ٹھکانا

اے کاش کوئی کہہ دے صیاد سے یہ جاکر
اچھا نہیں ہے ظالم حد سے سوا ستانا

انجام سے تو ظالم شاید کہ بے خبر ہے
تجھ کو بھی ایک دن ہے رخت سفر اٹھانا

اداریہ

شمع بجھ کر رہ گئی...

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

''تعمیرِ حیات'' کے گذشتہ شمارہ میں ندوہ کی بزمِ دوشیں کی آخری شمع کے خاموش ہونے کی خبر تھی۔ 'اداریہ' میں مدیرِ محترم مولانا شمس الحق ندوی کے قلمِ دل سے کچھ جذبات بھی تھے' جو بتا رہے تھے کہ یادگار رونقِ محفل کے اٹھ جانے کے بعد محفل کس طرح احساسِ محرومی سے اپنی ویرانی پر ماتم کناں ہے۔

شمع بجھ کر رہ گئی، پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اِک داغ دل پر رہ گیا

مرزا محمد ہادی عزیز رسوا لکھنوی

حقیقت بھی یہی ہے کہ مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کی پوری زندگی ایک ادارہ کی علمی و عملی ترجمان اور نشان ہی نہیں تھی، ایک ملت کی نمائندگی بھی تھی۔ علامہ شبلیؒ کے انتقال کے بعد ان کے باکمال شاگرد رشید اور علوم شبلی کے حقیقی وارث اور مسندِ شبلی کے جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاد کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: انھوں نے بتیس سال اپنی نوا سنجیوں سے ملت کو پُرشور رکھا۔ علامہ شبلیؒ نے ستاون سال کی عمر پائی تھی، جس میں بتیس سال، گویا نصفِ عمر سے زیادہ کا حصہ قوم وملت کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے اور سلجھانے میں گذر گیا۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندویؒ نے قریب چورانوے سال کی عمر پائی، جس میں قریب ستر سال انھوں نے ندوہ کے ذریعہ قوم کی خدمت، خبر گیری اور رہنمائی میں وقف کر دیے۔ مولانا مرحوم کے درازیٔ عمر کے ساتھ ان کے کارناموں کا سلسلہ بھی اسی طرح دراز ہوا، اور ان کے انتقال کے بعد جس طرح علمی و دینی دنیا میں ان کے رخصت ہونے کا ماتم بپا ہے' وہ بتاتا ہے کہ مولانا کی زندگی دوسروں کی زندگی پر کتنی اثر انداز تھی، اور یہ اثر اندازی اب ان کی ظاہری زندگی کے پورا ہونے کے باوجود شاید پہلے کی طرح یا اس سے زیادہ ہی اثر آفریں ہے۔ مولانا کی خدمات کا تقاضا ہے کہ ندوہ کا ہر شعبہ خصوصاً ''تعمیرِ حیات'' ان کی یادوں اور کارناموں، بلکہ ایک مکمل سعید زندگی کے نقوش کو سمیٹنے اور پھر عام افادہ کے لیے ان کو پیش کرنے کی کوشش کرے۔ ندوہ کی روایتوں میں ہے کہ وہ ملت کے مخلص خدمت گزاروں اور اپنی محسن شخصیتوں کی زندگی اور اسلام کی تبلیغ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اسلام کے پیغامِ انسانیت کی اشاعت کے لیے ان کی کاوشوں اور جہادِ زندگانی میں ان معرکہ آرائیوں کی داستانوں کو سمیٹنے کر پیش کرے۔ ادارہ ''تعمیرِ حیات'' نے اپنے بزرگوں کے کمالات کے اعتراف اور ان کی خدمات کے فیض کو جاری رکھنے کی غرض سے اعلان کر دیا ہے کہ جلد ہی مولانا سعید الاعظمی ندویؒ کی قابلِ رشک اور قابلِ قدر اور لائقِ تقلید زندگی کا ایک مرقع شائع کرے گا۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے فوراً بعد ہی عوام و خواص ہر طرف سے تاثرات کی ایک لہر آئی ہوئی ہے۔ ان تاثرات کے ساتھ مولانا کے عمل اور افکار کی معنویت اور ضرورت پر بھی تحریروں کی توقع ہے۔

مولانا اعظمیؒ کی زندگی ہی میں اصحابِ نظر اس حقیقت کا برملا اظہار کرتے تھے کہ زمانہ کے تغیرات اور مسلسل گردشِ روزگار کے فطری اثرات کے باوجود' مولانا مرحوم کے مضامین اور خیالات کی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ ان کے مضامین میں زمانہ کی طویل فاصلوں کا احساس نہیں ہوتا۔ فکر، طرز، انداز اور رنگ' سب میں جو اسلام کے لیے تڑپ اور درد، اور حق بات کہنے کی جرأت و کیفیت شروع میں تھی' آخر تک موجود اور برقرار رہی۔ یہ خوبی مولانا کی عربی تحریروں میں تو بدرجۂ اتم تھی ہی، اور جو ان کے قلم کی سب سے بڑی پہچان رہی؛ لیکن اردو میں بھی ان کی تحریروں کی بلاغت، زورِ بیان، تاثیر اور دل میں اتر جانے کی خوبی کا عام اقرار ہوتا رہا۔ ایک جگہ ایک صاحبِ عمل کی یہ بات بھی نظر آئی کہ مولانا اعظمی مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ مولانا کبھی مایوس اور ناامید نہیں ہوتے تھے۔ ان کے لیے اندھیروں اور تاریکیوں کا وجود دراصل روشنی اور کرنوں کے ظہور کی اطلاع بن جاتا تھا۔ آج کے دور میں اسی 'رجائیت' بلکہ 'رجولیت' کی ضرورت ہے۔

مولانا مرحوم کی زندگی کے مطالعہ کی کوشش کی جانی چاہیے، اور اس کے اظہار کے لیے ''تعمیرِ حیات'' کی خصوصی اشاعت کے اوراق طالب بھی ہیں اور منتظر بھی.....

☆☆

تعلیم القرآن

نفاقِ عملی اور چند اہم باتیں

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

منافقین کی دوسری قسم عملی منافق کی ہے، احادیث میں آنحضرت ﷺ نے اس کی بہت سی صفات بیان کی ہیں، ایک حدیث میں ہے:

"أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا، أَوْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْ أَرْبَعٍ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ." (صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب إذا خاصم فجر: ۲۴۵۹)

(چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں ہوں وہ منافق ہے، یا جس میں ان چار میں سے ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے؛ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ جب عہد کرے تو دغا دے۔ جب جھگڑا کرے تو حد سے بڑھ جائے (گالی گلوچ اور بے انصافی پر اتر آئے۔)

حدیث کے اندر مذکورہ باتوں میں نفاق کا تذکرہ اسی لیے ہے کہ عمل میں اندر اور باہر کی یکسانیت نہیں ہے، نفاق کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ اندر کچھ ہے اور باہر کچھ، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کہہ کچھ کر رہا ہے اور کر کچھ رہا ہے، اس کو امانت دار سمجھ کر امانت دی جا رہی ہے لیکن وہ اس میں خیانت کر رہا ہے، گویا وہ اظہار امانت کا کر رہا ہے لیکن اندر سے خائن ہے۔ اسی طرح باہر سے اظہار کرتا ہے کہ ہم ایسا کریں گے لیکن اندر یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ نہیں کریں گے، گویا اندر اور باہر کا فرق ہے۔

ایک مرتبہ حضرت حنظلہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ حنظلہ تو منافق ہو گیا انھوں نے کہا: ایسا کیا ہوا؟ بولے کہ جب میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو ایک الگ کیفیت ہوتی ہے لیکن جب باہر نکلتا ہوں تو گھر بار میں ایسا لگ جاتا ہوں کہ کیفیت ہی بدل جاتی ہے، گویا یہ تو نفاق ہے کہ وہاں کیفیت کچھ ہے اور یہاں کچھ۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: اگر تم اس کیفیت کو نفاق سمجھتے ہو تب تو ابوبکر بھی منافق ہے، پھر یہ دونوں حضرات حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ بات پیش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! إِنْ لَوْ تَدُومُونَ عَلَى مَا تَكُونُونَ عِنْدِي وَفِي الذِّكْرِ، لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ، وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً." (مسلم: ۷۱۴۲)

(اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ہمیشہ اسی کیفیت پر قائم رہو جس کیفیت میں میرے پاس ہوتے ہو اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ! یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی کیفیت کا آنا جانا نفاق کی علامت نہیں ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ بعض صحابہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں ایسے ایسے وسوسے آتے ہیں جنھیں ہم اپنی زبان پر نہیں لا سکتے، ایسا لگتا ہے کہ ہم منافق ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر واقعی تمہارے اندر ایسے وسوسے آتے ہیں تو یہی عین ایمان ہے کہ تم اس کو برا سمجھ رہے ہو، اب تم اگر اس کو دل میں بسا لیتے اور تمہارا عمل اس کے مطابق ہوتا تو یقیناً یہ نفاق اور فسق و کفر ہو جاتا لیکن تم اس کو برا سمجھ رہے ہو اور یہی برا سمجھنا' عین ایمان ہے۔

(مسلم: ۲۰۹)

حاصل یہ کہ ہمارے سامنے یہ سارے حقائق کھول دیے گئے ہیں کہ ایک نفاق اعتقادی ہے اور ایک نفاق عملی ہے یعنی اندر کچھ ہے اور باہر کچھ، ایک روایت میں اسی عملی نفاق کے متعلق یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ

"اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ."

(جو شخص ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اسے دی ہی نہیں گئی، وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے

کی طرح ہے)

بعض لوگ دو طرح کے لباس پہنتے ہیں، ایک لباس دکھانے کا اور دوسرا ان کے اندر کا یعنی اوپر کچھ ہوتے ہیں اور اندر کچھ، ان کے بارے میں روایت میں سخت الفاظ ہیں، اسی لیے ہمیں اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم کو کیا سمجھا جا رہا ہے اور ہم کیا ہیں؟ جو حضرات علماء ہیں اور جن کو بڑا دین دار سمجھا جاتا ہے، ان سب کو اپنا اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ دنیا ہمیں کیا سمجھ رہی ہے اور فی نفسہٖ ہم کیا ہیں؟ پھر کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو صحیح رخ پر لائیں، اگر ہمارے اندر واقعۃً کوتاہیاں ہیں تو ہم ان کوتاہیوں کو دور کریں۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہمارے اندر کہیں نفاق کی کوئی شکل نہ آجائے مثلاً: ہم اپنی بزرگی کا ڈھنڈورا پیٹیں، یا بزرگی کا مظاہرہ کریں جب کہ ہم اپنے آپ کو خوب جانتے ہیں، اگر کوئی اپنی بزرگی کا مظاہرہ کر رہا ہے، وہ خواب بیان کر رہا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی بزرگی کا چرچہ کر رہا ہے، یا واقعات وکرامات کا مظاہرہ کر رہا ہے تو یہ بھی نفاق ہی کی ایک شکل ہے، وہ جانتا ہے کہ ہم کیا ہیں؟ پھر بھی وہ بزرگی کا اظہار کر رہا ہے، اہل اللہ کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخری درجہ کے متواضع ہوتے ہیں اور وہ کبھی بھی اس بات کا اظہار نہیں کرتے کہ ہم کچھ ہیں بلکہ وہ مشیخت سے دور ہوتے ہیں۔

منافقین کے متعلق حضرت حسن بصریؒ کا جملہ مشہور ہے وہ فرماتے تھے کہ

"لو هلک المنافقون لاستوحشتم فی طرقاتکم من قلة السالک"

(مدارج السالکین: ۱/۳۵۸)

(اگر منافقین ہلاک ہو جائیں تو تم اپنے راستوں میں چلنے والوں کی کمی کی وجہ سے وحشت محسوس کروگے)

گویا منافقین کی تعداد اس حد تک تھی کہ اگر منافق نہ رہیں تو راستوں میں سناٹا چھا جائے، بہت سے لوگ اس قول کی یہ تشریح بھی کرتے ہیں کہ اس جملہ سے نفاق اعتقادی ہی نہیں بلکہ نفاق عملی بھی مراد تھا۔

نفاق اعتقادی کے جاننے پہچاننے کا اب کوئی راستہ نہیں ہے، اسی لیے یہ بات کہی گئی کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں نفاق تھا لیکن اس کے بعد اب یا تو کفر ہے یا ایمان، اگر کوئی منافق ہے تو ہم اس کو پہچان نہیں سکتے، آپ ﷺ کے زمانہ میں تو وہ ٹولہ پہچانا جاتا تھا، اس لیے کہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں منافق ہے اور آپ بتا بھی دیتے تھے، گویا عہد نبوی ﷺ میں تین گروہ تھے:

(۱) مومنین (۲) منافقین (۳) مشرکین۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد دنیا میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر آدمی یقینی طور پر یہ جان لے کہ فلاں منافق ہے، ہاں! کبھی طرز عمل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں، مستشرقین اس کی بہترین مثال ہیں جو منافقین ہی کا کام کرتے ہیں، وہ علم کا خوب اظہار کرتے ہیں، بعض مرتبہ تفسیر وحدیث اور علوم فقہ میں ان کو ایسی مہارت نظر آتی ہے کہ اچھے اچھے علماء پیچھے رہ جائیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہوتے۔

نواب چھتاری نے عجیب قصہ لکھا ہے کہ جب وہ لندن گئے تو ان سے ایک صاحب نے کہا کہ ہم آپ کو ایک ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں آپ حیرت میں پڑ جائیں گے لیکن یاد رہے کہ آپ وہاں اپنی زبان نہ کھولئے گا، وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سامنے دروازہ تھا اور اس پر جلی حروف میں کسی جامعہ کا نام لکھا ہوا تھا جو دیکھنے میں کوئی بڑا مدرسہ معلوم ہوتا تھا، جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں ہمیں جبہ ودستار میں لوگ نظر آئے، وہاں کہیں بخاری کا درس ہو رہا ہے تو کہیں مسلم اور ترمذی کا، ہمیں یہ سب دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہاں انگلستان میں یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟ لیکن جو صاحب ہمیں لے گئے تھے انھوں نے خاموش رہنے کی تاکید کر دی تھی اس لیے ہم خاموش رہے، جب ہم باہر نکل آئے تو ان صاحب نے بتایا کہ یہ سارے لوگ عیسائی یا یہودی تھے، ان کا کام یہ ہے کہ وہ اسلام کی بھرپور معلومات حاصل کریں اور پوری طرح سے شریعت کا علم حاصل کریں، قرآن وحدیث اور سیرت وفقہ کی جزئیات پر گہری نگاہ رکھیں تاکہ وہ اس میں خامیاں نکال سکیں اور دوسروں کے لیے شکوک وشبہات پیدا کر سکیں پھر اس کے نتیجہ میں اسلام پر لوگوں کا اعتماد متزلزل کر سکیں۔

ظاہر ہے ان سے بڑا منافق کون ہو سکتا ہے جن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ مسلمان ہیں لیکن آخری درجہ کے کافر ومشرک اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، گویا اس دور میں بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

تعلیم الحدیث

اللہ کی بندگی یا مال واسباب کی غلامی

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ، وَالدِّرْهَمِ، وَالْقَطِيفَةِ، وَالْخَمِيصَةِ، إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ، وَإِنْ لَمْ يُعْطَ لَمْ يَرْضَ۔ (البخاری: ۲۸۸۶)

ترجمہ: سونے کے سکے کا بندہ برباد ہوا، چاندی کے سکے کا بندہ برباد ہوا، مخملی چادر کا بندہ برباد ہوا اور نفیس عمدہ لباس کا بندہ برباد ہوا؛ اگر اسے دیا جائے تو خوش ہو جائے، اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جائے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۵۶) توحید کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ یہ انسان کو ہر طرح کی غلامی سے نکال کر صرف ایک رب کے سامنے جھکا دیتی ہے۔ بقولِ شاعر:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ!

جو سر ایک اللہ کے سامنے جھک جاتا ہے، وہ دنیا کی کسی چیز کے آگے نہیں جھکتا۔ لیکن جب انسان اللہ کی بندگی چھوڑ دیتا ہے تو وہ ہزاروں چیزوں کا غلام بن جاتا ہے۔ انھی میں ایک بڑی غلامی مال، دولت، ساز وسامان اور مادیت کی غلامی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ایسے انسان کو دنیا کا پجاری اور بندہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے مال اور روپے پیسے کے لیے دینار و درہم کا نام لیا، اور مال و اسباب کے لیے قطیفہ (روئیں دار مخملی چادر) اور خمیصہ (نفیس دھاری دار چادر) کا ذکر فرمایا۔ جو شخص ان چیزوں کا بندہ بن جاتا ہے، اس کی ساری دوڑ دھوپ صرف مال اور ساز وسامان کے لیے رہ جاتی ہے۔ وہ ہر وقت اسی کی فکر میں گھلتا، اسی کے پیچھے بھاگتا اور رات دن اسی کی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر اسے مال و دولت ملے تو وہ خوش ہو جاتا ہے، اور اگر نہ ملے یا کچھ چھن جائے تو وہ رنجیدہ ہو کر اپنے رب سے شکوہ کرنے لگتا ہے۔ اس کی خوشی اور ناراضی کا مدار محض دنیا کے ملنے اور نہ ملنے پر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، جو شخص سچے دل سے اللہ کا بندہ بن جاتا ہے، وہ اللہ کی یاد اور اس کی بندگی میں یکسو رہتا ہے۔ اس کا دل ہر حال میں مطمئن رہتا ہے۔ پھر دنیا کی چمک دمک، روپیہ پیسہ اور عمدہ سامان اسے اپنی طرف کھینچ نہیں پاتے۔ مال اس کے پاس ہو تو بھی ٹھیک، نہ ہو تو بھی اس کے دل کا سکون ختم نہیں ہوتا۔

قرآنِ مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ اللہ نے انہیں عظیم بادشاہت اور بے انتہا مال عطا فرمایا تھا، لیکن جب ملکۂ سبا کے تحائف ان کے سامنے آئے تو انہوں نے بغیر کسی لالچ کے فرمایا: ﴿أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللَّهُ خَيْرٌ مِمَّا آتَاكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ﴾ ”کیا تم مال کے ذریعے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ اللہ نے مجھے جو دیا ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے تحفے پر خوش ہوتے ہو گے۔“

اسی طرح ذوالقرنین نے یاجوج وماجوج کے سامنے دیوار بنانے کے لیے لوگوں کی مالی پیش کش ٹھکرا دی اور فرمایا: ”ما مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ“ (الکھف: ۹۵) ”میرے رب نے مجھے جو کچھ دیا ہے، وہی سب سے بہتر ہے۔“

اسی قلبی بے نیازی کی مثال مغلیہ دور کے ایک بزرگ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ کے واقعے میں ملتی ہے۔ جب بادشاہ نے ان کی خدمت میں بڑی جاگیر کی پیش کش کی تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور اصرار پر فرمایا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾، یعنی دنیا کا سارا سامان ہی بہت تھوڑا ہے۔ جب پوری دنیا ہی تھوڑی ہے تو اس میں ہندوستان اس سے بھی تھوڑا ہوا، اور ہندوستان میں تمہارے چند گاؤں تو بالکل ہی معمولی ہوئے۔ پھر میں اس ذرا سی چیز کے لیے اپنے رب کو چھوڑ کر تمہارا احسان کیوں لوں؟

فائدہ: توحید کا ثمرہ یہ ہے کہ انسان کا دل دنیا کی غلامی سے چھوٹ جاتا ہے۔ دنیا اس کے ہاتھ میں رہتی ہے، دل میں نہیں بستی۔ مال زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، اصل مقصد نہیں بنتا۔ مومن اسباب کو کام میں لاتا ہے، مگر اسباب کا غلام نہیں بنتا۔ اسے مال ملے تو وہ اللہ کا شکر کرتا ہے، اور نہ ملے تو صبر کرتا ہے اور شکوہ نہیں کرتا۔ اس کا بھروسا، اس کی امید اور اس کی اصل خوشی صرف اللہ کی ذات سے وابستہ رہتی ہے۔

☆☆☆

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: اسوقت ملک کے بعض صوبوں میں مسلم عورتیں بھی ملازمت کرنے لگی ہیں، بلکہ بعض علاقوں میں شادی بیاہ کے لئے لڑکے والے ملازمت پیشہ بہوئیں تلاش کرنے اور رشتہ کرنے میں ان کو ترجیح دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ آج کے بے پردہ ماحول میں مسلم خواتین کے لئے سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کرنا شرعاً درست ہے؟ بالخصوص اس صورت میں جبکہ گھر کے ذمہ دار اس پر مجبور کریں تو کیا حکم ہے؟

جواب: ایسی ملازمت جس میں بے پردگی لازم آتی ہو تو عورتوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے، البتہ ایسی ملازمت جس میں بے پردگی کا اندیشہ نہ ہو مثلاً بچیوں کے اسکول میں تعلیم دینا یا بچیوں کے ہاسٹل میں نگرانی کا فریضہ انجام دینا یا شعبۂ خواتین کے دفاتر میں کام کرنا یا شعبۂ امراض نسواں میں نرسنگ وغیرہ کا کام کرنا تو شرعاً اسکی اجازت ہوگی۔ [جواہر الفقہ: ج ۴ / ص ۱۴۶]

سوال: گھر کی عورتوں سے تجارت کروانا مثلاً دکانوں پر بیٹھنے اور سامان فروخت کرنے کی ذمہ داری پر مامور کرنا شرعاً کیسا ہے؟ بالخصوص اس صورت میں جبکہ گاہک عورتوں کے علاوہ مرد بھی آتے ہوں؟

جواب: اصل مسئلہ عورتوں کے لئے کام یا تجارت کا نہیں، بلکہ پردہ کا ہے، اگر پردہ کے ساتھ تجارت کرنا ممکن نہ ہو تو شرعاً اسکی اجازت نہیں ہوگی، ہاں! اگر پردہ کی پابندی کے ساتھ ممکن ہو تو پھر منوع نہیں، لیکن یاد رہے کہ نان و نفقہ اور گھریلو ضروریات واخراجات کی تکمیل کی ذمہ داری مرد پر ہے، عورتوں پر نہیں، اس لئے گھر والوں کا عورتوں کو تجارت کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان" [جامع ترمذی: ج ۱ / ص ۲۲۲، رقم ۱۱۷۳] (عورت پردہ کی چیز ہے، جب وہ باہر نکلے گی تو شیطان اس سے جھانک تاک کرے گا)۔

سوال: عورت کے لئے سرکاری یا غیر سرکاری اسپتال میں نرسنگ کا کام کرنا اور اسکی ملازمت اختیار کرنا کیسا ہے؟

جواب: اسپتال میں اگر شعبۂ نسواں میں کام ہو یا بیمار عورتوں کے علاج یا ولادت میں تعاون کی ذمہ داری ہے تو عورتوں کے لئے شرعاً اسکی اجازت ہوگی، لیکن جنرل وارڈ میں اگر پردہ کا اہتمام نہ ہو سکے تو پھر شرعاً یہ ملازمت درست نہ ہوگی۔ ربیع بنت معوذؓ سے مروی ہے: "كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم نسقي الماء و نداوي الجرحى" [صحیح البخاری: ج ۱ / ص ۴۰۳] (ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ کے موقع سے تھے، ہم پانی پلاتے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے)۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ عورتوں کے لئے پردہ کے اہتمام کے ساتھ نرسنگ کی ملازمت جائز ہے۔

سوال: ایک خاتون سرکاری اسپتال میں نرسنگ کا کام کرتی ہے، سرکاری ڈیوٹی کے بعد گھر پر زچہ بچہ کا کام کرتی ہے، آنے والی بعض عورتیں بچہ نہیں چاہتی ہیں اور چار مہینے ہونے کے باوجود صفائی چاہتی ہیں اور یہ خاتون نرس یہ کام کرتی ہے، صفائی کروانے والیوں میں بعض شادی شدہ بھی ہوتی ہیں اور بعض غیر شادی شدہ، اور بعض غیر مسلم، سوال یہ ہے کہ اس خاتون کے لئے صفائی کے کام میں تعاون کرنا اور اجرت لینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: امراضِ نسواں اور ولادت میں نرس کا کام کرنا فی نفسہ درست ہے خواہ سرکاری اسپتال میں ہو یا پرائیوٹ میں، اور اسکی اجرت لینا بھی جائز ہے، لیکن چار ماہ یا اس سے زائد مدت گزرنے کے بعد بلا عذر شرعی اسقاط کرانے والی عورتوں کی صفائی میں تعاون کرنا درست نہیں ہے، بلکہ گناہ ہے اور اجرت لینا بھی درست نہیں ہے، "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" [مائدہ: ۲] وجہ اسکی یہ ہے کہ چار ماہ میں بچہ میں روح ڈال دی جاتی ہے اور اسکی حیثیت ایک انسانی جان کی ہو جاتی ہے، اس وقت اسقاط حمل (صفائی) کا عمل انسانی جان کے قتل میں شمار ہوتا ہے: اذا كان الحمل قد بلغ مأة وعشرين يوماً لايجوز إسقاطه الخ...

[قرار المجمع الفقه الاسلامي لرابطة العالم الاسلامي في دورة الثانية عشر المنعقدة بمكة المكرمة]

☆☆☆

فکرونظر

ہندوستان کی جمہوری وسیکولر شناخت
اہمیت اور تحفظ کے تقاضے

انیس احمد ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

یہ بات زبان زدِ خاص وعام ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے۔ یہاں کی تہذیب زمانۂ قدیم سے گنگا جمنی تہذیب رہی ہے۔ گنگا اور جمنا کے سنگم کی طرح یہاں مختلف اقوام ومذاہب اور گوناگوں رنگ ونسل سے تعلق رکھنے والے لوگ باہم شیر وشکر ہوکر رہتے آئے ہیں۔ مختلف ثقافتوں نے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوکر ہندوستانی تہذیب وتمدن کی تشکیل کی ہے۔ اسی طرح کثرت میں وحدت (Unity in Diversity) بھی یہاں کا امتیاز رہی ہے۔ ہندوستان ایک تکثیری معاشرہ (Pluralistic Society) ہے، جس سے مراد ایسا معاشرہ ہے جہاں مختلف قومیں، تہذیبیں اور ثقافتیں مل جل کر اجتماعی زندگی کو تشکیل دیتی ہیں اور ایک دوسرے کے تئیں رواداری، احترام اور برداشت کے جذبات رکھتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے کا سب سے بڑا امتیاز مختلف قوموں اور تہذیبوں کا سنگم ہونا ہے۔ اگر اس خصوصیت میں کمی آجائے یا اس پر کوئی داغ لگ جائے تو ہندوستانی تہذیب کی اصل روح ماند پڑنے لگے گی۔ تہذیب کی ان خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لیے آئینِ ہند میں متعدد اصولوں کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ شہریوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے اور ان کے بنیادی فرائض بھی متعین کیے گئے ہیں۔ بنیادی حقوق کو شہریوں تک پہنچانا اور ان کا تحفظ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، جب کہ شہریوں کے فرائض میں ملک کی تعمیر وترقی اور خوش حالی میں حصہ لینا، قومی یک جہتی کو فروغ دینا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے میں اپنا کردار ادا کرنا شامل ہے۔ جب ان حقوق کی خلاف ورزی ہو یا معاشرتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچے تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کے مطابق کارروائی کرے۔

ہندوستان کے تناظر میں جمہوریت (Democracy)، سیکولرزم (Secularism) اور تکثیریت (Pluralism) کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے، کیوں کہ یہاں مختلف مذاہب، زبانوں، ثقافتوں اور معاشرتی گروہوں کے لوگ آباد ہیں۔ ان اصولوں کی اہمیت محض آئینی اعتبار سے نہیں، بلکہ ہندوستان کی تہذیبی شناخت کے حوالے سے بھی مسلم ہے۔ ہندوستان کا حسن اسی وحدت میں پوشیدہ ہے اور اس کی قوت کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

اگرچہ ملک میں فسطائی رجحانات رکھنے والی طاقتیں آزادی سے بہت پہلے ہی معاشرتی ہم آہنگی اور پُرامن بقائے باہم کے خلاف سرگرم رہی ہیں اور ملک کو ایک مخصوص نظریے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی آئی ہیں، تاہم وقت کے ساتھ ان رجحانات کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔ بعض عناصر امن کے نام پر بدامنی، اصلاح کے نام پر فساد اور سماجی شناختوں کے تحفظ کے نام پر تعصب وتفریق کو فروغ دیتے رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ نفرت اور تشدد کی سیاست نے ملک کو بھاری نقصان پہنچایا ہے۔ اسی نفرت انگیز ذہنیت کے ہاتھوں مہاتما گاندھی، جنہیں قوم کا باپو کہا جاتا ہے، بھی قتل ہوئے۔ بیسویں صدی کے نصفِ آخر، بالخصوص آخری دو دہائیوں سے، نفرت کی سیاست میں مزید شدت محسوس کی جانے لگی، اور اب یہ رجحان معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کررہا ہے۔ نتیجتاً الفت، محبت، رواداری اور باہمی احترام کے چراغ مدھم پڑتے جارہے ہیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں، مثلاً سیاست، تعلیم، معیشت، معاشرت، طرزِ رہن سہن اور عملی زندگی میں تعصب کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں۔ عصبیت اور تنگ نظری کا زہر معاشرے میں پھیلتا جارہا ہے۔ ایسے حالات میں یہ اندیشہ فطری ہے کہ آئینِ ہند میں جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، وہ تعصب اور امتیازی رویوں کی نذر نہ ہوجائیں۔

بنیادی حقوق میں آزادیِ اظہارِ رائے کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستانی آئین کا آرٹیکل 19(1)(a) شہریوں کو آزادیِ اظہارِ رائے کا حق دیتا ہے، اگرچہ یہ حق قانون کے تحت مقررہ معقول پابندیوں کے تابع ہے۔ اس آزادی کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ اختلافِ رائے کو برداشت کیا جائے۔ کسی معاملے میں میری رائے دوسروں سے مختلف ہوسکتی ہے، لیکن اس اختلاف کی بنیاد پر کسی کی تضحیک کرنا یا اسے اظہارِ رائے سے محروم کرنا درست نہیں۔ اسی طرح مذہبی رہنماؤں اور مقدس شخصیات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بھی احترام اور ذمہ داری کا مظاہرہ ضروری ہے۔ مذہبی معاملات میں تنقید، اختلاف یا اظہارِ خیال اور دانستہ طور پر مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے درمیان فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ البتہ ہر ناپسندیدہ یا توہین آمیز سمجھے جانے والے بیان کو خود بخود قابلِ سزا جرم قرار نہیں دیا جاسکتا؛ اس کا فیصلہ متعلقہ قانون، بیان کے سیاق وسباق اور قانونی تقاضوں کی روشنی میں ہونا چاہیے۔

ہندوستان میں نفرت انگیز تقریر (Hate Speech) اور مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے متعلق قوانین کے اطلاق اور ان کی تنفیذ پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ان قوانین کی زبان اور تشریح میں ایسی وضاحت ہونی چاہیے کہ ان کا منصفانہ اور یکساں اطلاق ممکن ہو اور ان کا غلط استعمال نہ کیا جاسکے۔ مذہبی جذبات کو دانستہ اور بدنیتی کے ساتھ مجروح کرنے اور کسی مخصوص طبقے کے خلاف نفرت، دشمنی یا تشدد کو ہوا دینے والے بیانات کے خلاف مؤثر قانونی کارروائی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ جائز تنقید، علمی مباحثے اور اختلافِ رائے کو بلاوجہ جرم کے دائرے میں نہ لایا جائے۔

ماضی میں تعزیراتِ ہند کی دفعہ 295A مذہبی جذبات کو دانستہ اور بدنیتی کے ساتھ مجروح کرنے والے بعض افعال سے متعلق تھی۔ یہ دفعہ 1927ء میں اس وقت متعارف کرائی گئی، جب برطانوی ہندوستان میں مذہبی تنازعات اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے واقعات سامنے آرہے تھے۔ تاہم اس دفعہ کا دائرۂ اطلاق ہر قسم کی مذہبی تنقید، طنز یا اختلافِ رائے تک وسیع نہیں ہے؛ اس کے لیے قانون میں مقررہ ارادی اور بدنیتی پر مبنی عناصر کا پایا جانا ضروری ہے۔ آزادی کے بعد بھی اس قانون کے اطلاق اور حدود کے بارے میں مختلف مواقع پر بحث ہوتی رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مذہبی جذبات کے تحفظ اور آزادیِ اظہارِ رائے کے درمیان آئینی توازن برقرار رکھا جائے۔

نفرت انگیز تقریر سے متعلق قوانین کا بنیادی مقصد ایسے اظہار کو روکنا ہے جو مختلف گروہوں کے درمیان دشمنی، امتیاز یا تشدد کو ہوا دے، سماجی ہم آہنگی کو نقصان پہنچائے یا کسی طبقے کے حقوق سے محرومی کی وکالت کرے۔ تاہم ان قوانین کے مؤثر اطلاق کے لیے واضح قانونی معیار، غیر جانب دار تفتیش اور منصفانہ عدالتی کارروائی ناگزیر ہیں۔ اگر نفرت انگیز بیانات دینے والے بااثر افراد کے خلاف کارروائی نہ ہو تو قانون کی ساکھ متاثر ہوتی ہے اور معاشرے میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قانون سب کے لیے یکساں نہیں۔

قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں اور سب کو یکساں قانونی تحفظ حاصل ہونا چاہیے۔ مذہب، نسل، ذات، زبان، جنس یا جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ اکثریت یا اقلیت کی حیثیت بھی قانون کے منصفانہ اطلاق میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ قانون میں موجود کسی سقم یا ابہام سے فائدہ اٹھا کر کسی مخصوص گروہ یا برادری کو ناجائز فائدہ پہنچانا عدل و انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ آئینِ ہند مساوات، آزادی اور قانونی تحفظ کے اصولوں کی ضمانت دیتا ہے؛ ان اصولوں کی حقیقی معنویت اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جب ان پر بلاامتیاز عمل کیا جائے۔

اسی سلسلے میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔ ہر معاشرے میں اقلیتی گروہ موجود ہوتے ہیں اور ان کے حقوق کا تحفظ ایک منصفانہ ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اکثریت کو اپنی عددی برتری کی بنیاد پر اقلیتوں کے حقوق نظرانداز کرنے کا اختیار نہیں دیا جاسکتا۔ بعض حالات میں تعصب اور اشتعال انگیزی کے نتیجے میں اقلیتی گروہوں کے خلاف ظلم و زیادتی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ متاثرہ افراد کو تحفظ فراہم کرے، مجرموں کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کرے اور کسی بھی گروہ کے ساتھ امتیازی سلوک نہ ہونے دے۔

یقیناً نفرت کی سیاست ملک کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ اس سے ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ اور جمہوری شناخت متاثر ہوتی ہے اور جمہوری نظام کی بنیادیں کمزور پڑتی ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر نظر ڈالنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض سیاسی عناصر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے نفرت انگیز بیانات اور فرقہ وارانہ تقسیم کو مسلسل ہوا دیتے ہیں۔ مقامی سطح کے بعض رہنما کسی مخصوص برادری کو اپنی اشتعال انگیز تقاریر کا نشانہ بناتے ہیں، لیکن ان کے خلاف مؤثر کارروائی نہ ہونے سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، بعض اوقات ایسے بیانات کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو فوری قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا امتیازی طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو قانون کی غیر جانب داری پر سوالات اٹھنا فطری ہے۔

خواہ معاملہ ہجومی تشدد (Mob Lynching) کا ہو، اقلیتوں کو ہراساں کرنے کا، مسلمانوں کے قتلِ عام کی دھمکیوں کا یا اشتعال انگیز بیانات کا، ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر معاملے میں قانون کے مطابق منصفانہ کارروائی کریں۔ جب کسی شخص یا گروہ کی شناخت اس کے لباس، مذہب یا ظاہری وضع قطع کی بنیاد پر متعین کرکے اسے نشانہ بنانے کا رجحان بڑھتا ہے تو یہ جمہوری اقدار کے لیے تشویش ناک صورتِ حال ہوتی ہے۔

اسی طرح قانونی طریقۂ کار کی پابندی کے بغیر کسی کی جائیداد منہدم کرنا، احتجاج کرنے والوں کو ان کے جمہوری حق سے محروم کرنا یا کسی ملزم کو عدالتی کارروائی سے پہلے سزا دینے جیسا طرزِ عمل اختیار کرنا قانون کی حکمرانی کے منافی ہے۔ جائیداد کے تحفظ، عدالت سے رجوع کرنے اور منصفانہ سماعت کے حقوق کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی تعمیر یا جائیداد کے خلاف کارروائی ضروری ہو تو متعلقہ اداروں کو قانونی تقاضے پورے کرنے، متعلقہ فریق کو نوٹس دینے اور اس کا موقف سننے کے بعد غیر جانب دارانہ فیصلہ کرنا چاہیے۔ محض کسی شخص کے ملزم ہونے کی بنیاد پر اس کے بنیادی حقوق ختم نہیں ہوجاتے۔ جرم کا تعین اور سزا کا فیصلہ مجاز قانونی اداروں اور عدالتوں کا کام ہے، نہ کہ ہجوم

یاانتظامیہ کی من مانی کا۔

یہ ایک افسوس ناک صورتِ حال ہے کہ بعض اوقات ملک کی بدنامی کا سبب بننے والے عناصر کے خلاف مؤثر کارروائی نہیں ہوتی، جب کہ ان کے طرزِ عمل پر تنقید کرنے والوں کے خلاف فوری مقدمات درج کر لیے جاتے ہیں۔ اگر قانون کے نفاذ میں اس نوعیت کا عدم توازن پایا جائے تو اس سے نفرت انگیز ذہنیت کو تقویت ملتی ہے اور شہریوں کا نظامِ انصاف پر اعتماد کمزور ہوتا ہے۔ سیاسی مقاصد کے لیے کسی ایک برادری کو مسلسل نشانہ بنانا جمہوری اصولوں کے خلاف ہے۔ گجرات، اتر پردیش اور مدھیہ پردیش سمیت مختلف ریاستوں کے سیاسی حالات کے حوالے سے اس طرزِ سیاست پر بحث ہوتی رہی ہے۔ تاہم ملک کے مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کا محور فرقہ وارانہ تقسیم کے بجائے عوامی فلاح، تعلیم، صحت، روزگار، معاشی ترقی اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی ہو۔

ملک کو ہر وقت انتخابی مہم کی فضا میں رکھنے کے بجائے اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے سنجیدہ کوششیں کی جانی چاہییں۔ توڑنے کے بجائے جوڑنے، تقسیم کرنے کے بجائے یک جہتی پیدا کرنے اور نفرت پھیلانے کے بجائے محبت و رواداری کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی سالمیت، اتحاد و اتفاق، دوستی و یگانگت، امن و امان اور بھائی چارے کو عزیز رکھنا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اسی طرزِ عمل سے شہری آزادیوں کا تحفظ ممکن ہوگا، معاشرے میں امن و امان قائم ہوگا اور ملک ترقی و خوش حالی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہو سکے گا۔ ہندوستان کی حقیقی عظمت اسی میں ہے کہ یہاں اختلاف کے باوجود احترام، تنوع کے باوجود اتحاد اور مختلف مذاہب و ثقافتوں کے باوجود باہمی اعتماد اور بقائے باہم کی روایت مضبوط رہے۔

☆☆☆

اعلان خصوصی اشاعت بیاد

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

قارئینِ کرام!

"تعمیرِ حیات" کا ایک خصوصی شمارہ ندوۃ العلماء کے قابل فخر فرزند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم، حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات کے تذکرے اور ان کی علمی و دینی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مختص کیا جا رہا ہے۔

اہلِ قلم سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنی تازہ نگارشات درجِ ذیل موضوعات کی روشنی میں مرتب کر کے سالِ رواں کے ماہِ نومبر کے اختتام تک دفتر "تعمیرِ حیات" کو ارسال فرمائیں۔

موضوعاتِ نگارش

شخصی و خاندانی کوائف	تعلیم و تربیت
سیرت و اخلاق	تدریسی و انتظامی خدمات
مناصب و عہدے	علمی و ادبی خدمات
صحافت و خطابت	تصنیفات و تالیفات

واقعات، مشاہدات و تاثرات

نوٹ: اہلِ قلم سے گزارش ہے کہ مضامین ٹائپ شدہ، نظرِ ثانی شدہ اور اغلاط سے پاک ہوں، تاکہ اشاعت کے مراحل میں سہولت رہے۔ اس تعاون کے لیے دفتر "تعمیرِ حیات" آپ کا شکر گزار ہوگا۔

ای میل: tameerehayat2026@gmail.com
برائے رابطہ: 9621540462 - 6202719928 - 9918818558

عمل پیہم

تعمیرِ شعور۔ فکری بیداری کا آغاز

محمد ناصر ندوی پرتاپ گڑھی

دنیا میں تمام انقلابات، بیداری کی تمام لہریں، اور اقوام کی ترقی کی تمام داستانیں ایک ہی نقطے سے شروع ہوتی ہیں اور وہ ہے ''شعور کی تعمیر''!

جب کسی فرد یا قوم کے اندر اپنے وجود، اپنی حیثیت، اپنے فرائض اور اپنے مقصدِ زندگی کا شعور بیدار ہوتا ہے، تبھی وہ کائنات میں اپنا مؤثر کردار ادا کر پاتے ہیں۔ قرآن مجید کی دعوت، فکری بیداری کی دعوت ہے۔ قرآن انسان کو غفلت سے نکال کر یاددہانی کراتا ہے:

أَفَلَا تَعْقِلُونَ (البقرہ: ۴۴) (کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ" (الزمر: ۹) (نصیحت تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔)

قرآن بار بار تفکر وتدبر کی دعوت دیتا ہے، جو شعورِ انسانی کے بنیادی اجزاء ہیں۔

''شعور'' کا لغوی مفہوم ،احساس، آگہی، بیداری اور بصیرت ہے۔ اصطلاحاً شعور سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے گردوپیش، اپنے مقام، اپنی ذمّہ داری اور اپنے وجود کی حقیقت کو سمجھ لے، اور اپنی فکری وعملی زندگی کو کسی مقصد کے تحت ترتیب دے۔ قوموں کی ترقی، ان کی عزت وعظمت اور قیادت نہ صرف مادی اسباب سے وابستہ ہے، نہ ہی محض تعلیمی ڈگریوں، خوشنما عمارتوں یا فنی مہارتوں تک محدود ہے، یہ سب اپنی جگہ اہم ضرور ہیں، لیکن اگر ان سب کے پیچھے ایک باشعور ذہن، بیدار دل، اور اعلیٰ فکر نہ ہو تو یہ تمام تر ترقی سطحی اور عارضی ہوجاتی ہے۔ اصل سرمایہ جو ایک قوم کو بامِ عروج تک لے جاتا ہے، وہ شعور اور بصیرت افروز زندگی ہے۔

شعور ایک داخلی روشنی کا نام ہے جو انسان کو اس کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے، اس کے مقصدِ حیات کو واضح کرتی ہے، اس کے کردار کو درست کرتی ہے، اور اس کی زندگی کا رخ متعین کرتی ہے، جب یہ روشنی ماند پڑ جاتی ہے تو انسان راستہ بھٹک جاتا ہے اور وہ محض بھیڑ کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے، اپنا تشخص وامتیاز کھو دیتا ہے، اور اسے نہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہ جاتا ہے، نہ وہ اپنی قوم کے درد کا درماں بنتا ہے، اور نہ امت کے مسائل سے سروکار رہ جاتا ہے، ایسے معاشرے بظاہر تو ترقی یافتہ لگتے ہیں، لیکن اندر سے کھوکھلے اور بے روح ہو کر امت کے لئے بے معنی ہوجاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے بارہا انسان کو سوچنے سمجھنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

''وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ'' (یونس: ۱۰۰) یعنی جو لوگ عقل استعمال نہیں کرتے، اللہ ان پر گندگی مسلط کردیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد صرف مذہبی رسوم کی ادائیگی سکھانا نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ کی سیرت کا ایک بڑا باب شعور کی بیداری پر مشتمل ہے۔ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کی غافل، بت پرست اور جہالت زدہ قوم کو دعوتِ فکر دی۔ ان سے سوال کیا:

''کیا یہ بت تمہاری بات سنتے ہیں؟

''تمہیں کچھ فائدہ یا نقصان دے سکتے ہیں؟

''کیا تم نے کبھی سوچا کہ زمین وآسمان کا نظام کس کے ہاتھ میں ہے؟''

یہ فکری سوالات تھے جنہوں نے صحابہ کرامؓ کے دلوں میں بیداری پیدا کی جس کے نتیجے میں ایک عظیم تمدن کا آغاز ہوا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف امت رحمہم اللہ کی زندگیاں تعمیرِ شعور کی روشن مثالیں ہیں، ان حضرات نے نہ صرف خود فکری بیداری اور ایمانی بصیرت حاصل کی بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی شعور دیا، اور عمل کے میدان میں ایسی عظیم قربانیاں پیش کیں جن کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی ہیں، ان کے نزدیک ایمان محض عقیدہ نہیں بلکہ احساس ذمہ داری، اور عمل واخلاص کا مجموعہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت اس شعور کی عظیم مثال ہے۔ آپ کی حکمرانی عدل وانصاف اور رعایا کے تئیں احساسِ ذمہ داری سے معمور تھی، آپ کا وہ مشہور قول کہ ''اگر فرات کے کنارے ایک بکری بھی پیاس سے مرگئی تو عمر سے اس کا حساب لیا جائے گا۔'' اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے دل میں ایک مؤمن کی زندگی کا کتنا گہرا شعور تھا۔!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عملی زندگی بھی شعور وحکمت سے بھرپور تھی، آپ کی فراست دینی، انسانی فطرت کی پہچان اور عدل وانصاف کا معیار مثالی تھا، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فکر ایک زندہ شعور کی علامت ہے، وہ ہر اُس چیز کے خلاف

آواز بلند کرتے جو دین کے معاشی اور سماجی اصولوں کے خلاف ہو، ان کی فکری بصیرت نے امت کو یہ درس دیا کہ صرف عبادت کافی نہیں بلکہ عدل ومساوات اور سماجی بھلائی کے لئے بھی اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہے۔

تابعین اور تبع تابعین کے دور میں شعور کی یہ شمع روشن رہی، اسلاف نے اس فکر واحساس کو جو منظم علمی وعملی شکل دی، وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی فقہی بصیرت نے امت کو اس وقت ایک مربوط دینی قانون دیا جب لوگ مختلف فکری وفقہی بحران کے شکار تھے۔ انہوں نے اجتہاد کو اصول بنا کر بتا دیا کہ دین ایک زندہ نظام ہے جو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علم وحکمت کے ساتھ رہنمائی کرسکتا ہے۔

امام غزالیؒ نے فلسفہ و مادیت پرستی اور باطنی فتنوں کا مقابلہ کیا، ان کی کتاب ''احیاء علوم الدین'' شعور دینی، شعور عبادت، شعور اخلاق اور شعورِ معاشرت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ ذہن کو صرف معلومات کا مرکز نہیں سمجھتے بلکہ اسے ہدایت وتقوی اور تعلق مع اللہ کا اہم ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان کی سرزمین پر شعور کی بیداری کے لئے شیخ احمد سرہندیؒ نے ایک عظیم تحریک برپا کی، انہوں نے دین الٰہی جیسے فتنوں کے مقابلے میں علم ومجاہدہ اور اپنی بصیرت کے ذریعے فکر وشعور کی وہ فضا پیدا کی جس نے پورے خطے کو دین پر استقامت عطا کی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے امت کو علمی و دینی شعور سے جوڑنے کے لئے عظیم جدوجہد کی، ان کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' آج بھی دینی شعور کی بنیاد ہے۔ ان کے نزدیک دین صرف عبادت کا نام نہیں بلکہ ایک جامع نظام ہے جو سیاست ومعیشت اور تعلیم وتربیت بلکہ زندگی کے ہر میدان میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے توحید خالص، غیرتِ دینی، اور عملِ صالح کی جو مثال قائم کی، وہ ایک انقلابی تحریک کی شکل اختیار کرگئی۔ انہوں نے امت کو یاد دلایا کہ محض الفاظ سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اخلاص کے ساتھ عمل اور دین کی خدمت کے لئے قربانی کا جذبہ موجزن نہ ہو، ان کی شہادت بھی اسی فکر کی فتح ہے۔

جدید دور میں علامہ اقبالؒ کی شاعری نے مسلمانانِ ہند کو جس دینی وایمانی شعور سے آشنا کیا وہ ناقابل فراموش ہے، ان کی فکر انقلاب کی چنگاری تھی۔

اسی طرح مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی تحریروں اور دعوتی اسفار میں شعورِ امت، شعورِ تاریخ، شعورِ دعوت، اور شعورِ اصلاح کو ایک تحریک کی شکل دی۔ ان کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' نے امت کو اس کے اصل مقام کا شعور دیا۔

یہ چند مثالیں ہمیں بتاتی ہیں کہ شعور کی تعمیر ہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک زندہ امت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، جب تک مسلمانوں کو اپنے دین کے تئیں اپنی ذمہ داری کا احساس، اپنی قومی شناخت کی فکر، اور اپنی زندگی میں اپنے کردار کا شعور حاصل نہ ہوگا، وہ صرف ماضی کی تاریخ کا ماتم کرتے رہیں گے۔

جب شعور بیدار ہوتا ہے تو غلامی کے زنجیریں ٹوٹتی ہیں، جہالت کے اندھیرے چھٹتے ہیں اور قومیں دوبارہ اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں، صحابہ کرام اور اسلاف امت کی زندگیوں سے یہی سبق ملتا ہے کہ شعور ہی اصل سرمایہ ہے، اور اسی کی بنیاد پر امت کی اصلاح اور بیداری ممکن ہے۔

آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے شعور کو معلومات سے خلط ملط کر دیا ہے، ہمیں معلومات تو بہت حاصل ہیں، مگر ان کا تجزیہ کرنے، ان پر غور کرنے، اور ان معلومات کو حق کے ترازو میں تولنے کی صلاحیت سے ہم محروم ہوتے جارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میڈیا کے فریب میں آجاتے ہیں، جھوٹے نعروں کے اسیر ہوجاتے ہیں، اور دشمن کی چالوں پر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب شعور مرجاتا ہے، اور انسان محض ایک نقال، تماشہ بیں اور بے سمت ہجوم کا حصہ بن جاتا ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ ہم نے تربیتِ شعور کو ترجیحات سے نکال دیا، ہماری تعلیم معلومات دیتی ہے، شعور نہیں دیتی۔ ہمارے تعلیمی ادارے نوکری کا ذریعہ تو بن گئے، مگر کردار سازی کے مراکز نہ بن سکے۔ ہماری دینی مجالس میں اکثر جذبات کا غلبہ رہا، بصیرت کی پرورش نہ ہوسکی، ہمارے منبر و محراب سے اصلاحی فکر کم اور وقتی جذبات زیادہ ابھارے گئے، ہم نے قرآن تو پڑھا، مگر اس کے تفکر وتدبر کے دروازے بند کردیئے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسی امت جس کے پاس آسمانی کتاب ہے، زندہ سنت ہے، صحابہ اور اسلاف کے عظیم کارنامے ہیں، وہ آج فکری پسماندگی کا شکار ہے۔

اس امر کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ہم دینی تعلیم کو محض عبادات اور فقہی مسائل تک محدود نہ رکھیں، بلکہ اس کے ذریعے انسان کو اُس کا مقام، اس کی ذمہ داری اور کردار کا شعور بیدار کریں۔ دین ہمیں صرف نماز وروزے کا ہی نظام نہیں دیتا، بلکہ وہ فکر کی تعمیر، عقل کی تطہیر، اور معاشرے کی اصلاح کا ایک مکمل ضابطہ عطا کرتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُفَقِّھْہُ فِی الدِّینِ''

اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔

شعور کی تشکیل کے دیگر اہم ذرائع میں مطالعہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کتاب انسان کا خاموش معلم، سچا دوست اور مخلص رہنما ہے۔ جو قومیں سنجیدہ کتابوں کے مطالعہ سے وابستہ ہوگئیں، وہ عروج کے زینے چڑھنے لگیں، اور جو مطالعہ سے جی چرانے لگیں وہ دھیرے دھیرے اپنے ماضی سے کٹ گئیں اور زوال کا شکار ہوگئیں، اہل علم ودانش کو چاہئے کہ قرآن وحدیث، سیرت وتاریخ اور جدید وفکری مسائل ومباحث پر گہری نظر رکھیں، اور امت مسلمہ کے نوجوانوں کی ایسی ذہن سازی کریں کہ وہ اسلام کے لئے جینا اور مرنا اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھیں، انہیں صالح صحبت، مخلص اساتذہ، علمی مجالس اور اہلِ اللہ کی مصاحبت کے مواقع فراہم کریں، نیکوں کی صحبت انسان کی شخصیت کو نکھارتی ہے، اور فکری وسعت عطا کرتی ہے۔

آج جب ہم چاروں طرف بگاڑ، فساد، بے راہ روی، اور نظریاتی انتشار دیکھتے ہیں، تو ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ سب شعور کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ فرقہ واریت، تعصب، شخصیت پرستی، سوشل میڈیا کی بے ہنگم تقلید، مغربی نظام کی اندھی نقالی، اور دینی شعور سے دوری یہ سب اسی خلا کے مظاہر ہیں۔

ایک بے شعور قوم دشمن کے نرغے میں آکر بھی جشن مناتی ہے، اور اصل دشمن کو پہچاننے سے قاصر رہتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم عملی طور پر شعور کی تعمیر کے میدان میں اتریں، ہماری مساجد صرف نماز پڑھنے کی جگہ نہ ہوں، بلکہ علمی وفکری مراکز بنیں۔ مدارس صرف درس وتدریس کے ادارے نہ ہوں، بلکہ بصیرت کے قلعے بنیں۔ خطبۂ جمعہ صرف دعاؤں کا مجموعہ نہ ہو بلکہ امت کی اصلاح، فکر وشعور کی بیداری اور سماج کی تربیت کا ذریعہ بنے۔ تعلیمی ادارے صرف امتحان پاس کرانے کا مرکز نہ ہوں، بلکہ فکری، تحقیقی، اور تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کی درسگاہ ہوں۔ ہمیں اپنے نوجوانوں کو صرف موبائل تھمانے کے بجائے فکری ذہن، احساس ذمہ داری اور قیادت کا شعور دینا ہوگا، انہیں یہ سکھانا ہوگا کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے صرف سانس لینا کافی نہیں، بلکہ کسی مقصد کے لئے جینا ضروری ہے۔

یہی شعور ہے جو دلوں کو زندہ کرتا ہے، ذہنوں کو تازگی بخشتا ہے، زبان کو صداقت کا ذائقہ دیتا ہے، کردار کو مقصد کا رخ عطا کرتا ہے، اور اقوام کو بیداری کی معراج تک پہنچاتا ہے۔ یہی شعور ہے جو کسی فرد کو خوابِ غفلت سے جگاتا ہے، اور پوری قوم کو ایک زندہ، باوقار اور متحرک امت میں ڈھال دیتا ہے۔

پس آج ہمیں صرف تبدیلی کی تمنا نہیں، تبدیلی کی تیاری کرنی ہوگی۔ ہمیں صرف روشنی کی دعا نہیں، چراغ جلانے کی ہمت کرنی ہوگی، اور یہ ہمت اسی وقت پیدا ہوگی جب شعور کی چنگاری ہر دل میں سلگے گی، ہر ذہن میں بھڑکے گی، اور ہر فرد کے سینے میں ایک دردمند داعی کی روح جاگ اٹھے گی۔ اگر ہم نے آغاز کرلیا، تو منزل خود ہماری طرف بڑھے گی۔ شعور کی یہ بیداری اگر ایک فرد میں پیدا ہوجائے، تو وہ فرد ایک تحریک بن جاتا ہے، اور اگر پوری قوم بیدار ہوجائے، تو تاریخ کا دھارا بدل سکتا ہے!!

☆☆☆

ایک ضروری اعلان

ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالے اردو پندرہ روزہ ''تعمیرِ حیات''، ہندی ماہنامہ ''سچا راہی'' اور انگریزی ماہنامہ ''دی فریگرینس آف ایسٹ'' کے معزز قارئین وخریدار حضرات سے عرض ہے کہ اب تک یہ رسالے سادے ڈاک سے صرف پچاس پیسے کا ٹکٹ لگا کر بھیجے جارہے تھے، لیکن ماہِ جنوری ۲۰۲۷ء سے سرکاری محکمۂ ڈاک نے اس نظام کو ختم کرنے کا آرڈر جاری کردیا ہے۔ اس لئے اب جملہ رسالے ماہ جنوری سے رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کئے جائیں گے، رسالے موصول نہ ہونے کی صورت میں دفتر کو اطلاع دے سکتے ہیں۔

ماہ جنوری ۲۰۲۷ء سے تینوں رسالوں کا سالانہ زرِتعاون حسب ذیل رہے گا:

۱۔ تعمیرِ حیات — ایک ہزار روپے -/1000

۲۔ سچا راہی — آٹھ سو روپے -/800

۳۔ فریگرینس آف ایسٹ — چھ سو روپے -/600

برائے رابطہ: 9559844716

دفتر تعمیرِ حیات، ندوۃ العلماء لکھنؤ 226007

حق وباطل

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات

محمد فرمان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

ابتدائے آفرینش ہی سے حق و باطل کے درمیان کشمکش اور دفاع و مدافعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اگرچہ اس کی صورتیں اور طریقۂ کار مختلف رہے ہیں، لیکن دشمنانِ اسلام نے ہر دور میں دینِ متین کی صورت مسخ کرنے، اس کے نقوش مٹانے اور اس کے خلاف شبہات و اعتراضات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ رب العزت نے دینِ اسلام کی حفاظت اور کتاب وسنت کی صیانت کا ذمہ خود لیا ہے اور اسے قیامت تک کے لیے محفوظ فرمایا ہے۔ چنانچہ باطل کی ہر یلغار کے مقابلے میں اہلِ حق کا ایک طبقہ ہمیشہ میدان میں آتا رہا ہے۔

ایک دور میں مستشرقین کے ایک طبقے نے علم و تحقیق کے پردے میں اسلام کے خلاف شبہات پھیلانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں سے بعض نے قرآن و سنت، تاریخ و سیرت اور اسلامی مصادر سے مواد اخذ کرکے اسے اپنے مخصوص زاویۂ نظر کے مطابق پیش کیا اور تعصب، تدلیس اور حقیقت کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کے ذریعے اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی بعض کاوشیں بظاہر علمی تھیں، لیکن ان میں جانب داری اور حقائق کی غلط تعبیر کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

ان اعتراضات کے جواب میں امت کے مختلف طبقات سے علما و محققین اٹھے اور انہوں نے قرآن وسنت اور معتبر تاریخی مصادر کی روشنی میں ان شبہات کا علمی و تحقیقی رد کیا۔ انہوں نے اسلام کی حقانیت، شفافیت اور پاکیزگی کو دلائل و براہین سے واضح کیا اور متعدد اعتراضات کے بودے پن کو نمایاں کیا۔ یوں باطل کی گرد چھٹتی گئی اور اسلام کی روشن حقیقت مزید نمایاں ہوتی چلی گئی، جس سے غیر مسلموں کے مختلف طبقات میں بھی حق شناسی اور ہدایت کی راہیں کھلیں۔

اسی پس منظر میں ذیل میں مستشرقین کے بعض اہم اعتراضات اور ان کے مقابلے میں علمائے اسلام کی علمی مساعی اور جوابات کی چند جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں۔

(۱) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو تلوار کے ذریعے پھیلایا

مستشرقین کے بعض اعتراضات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی رغبت و رضامندی سے اسلام میں داخل نہیں ہوئے، بلکہ انہیں جبراً مسلمان بنایا گیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے متبعین کو قتال پر ابھارا، وہ خون کے پیاسے تھے اور اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔

لیکن یہ دعویٰ اسلامی تاریخ اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام پہلوؤں کی جامع تصویر پیش نہیں کرتا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسلام کو اپنی رغبت و رضا سے قبول کیا اور اس کی تعلیمات میں اپنی گم شدہ مقصود و مطلوب شے پائی۔ جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب و متبعین کے معاملات، چال چلن، کردار و اخلاق اور عدل و انصاف کو دیکھا تو وہ ان سے متاثر ہوئے اور اسلام کی طرف مائل ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل ومساوات کی تعلیم دی، کمزوروں کے ساتھ نرمی، رحم دلی اور دادرسی کا معاملہ فرمایا اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور توحید کا پیغام دیا۔ یہی وہ تعلیمات اور پاکیزہ کردار تھا جس نے دلوں کو متاثر کیا اور انسانوں کو اسلام کے قریب کیا۔

پھر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کفار کے ظلم وستم اور طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار رہے، لیکن اس پورے دور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلح تصادم کا راستہ اختیار نہیں فرمایا۔ اس کے برعکس، مخالفین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو ستایا، ان کے خلاف محاذ قائم کیے اور بالآخر مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

ہجرت کے بعد پیش آنے والے بڑے معرکوں، مثلاً غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق، کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جان، ایمان اور اجتماعی بقا کے تحفظ کے لیے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان معرکوں کے اسباب اور تاریخی پس منظر کو نظر انداز کرکے یہ کہنا درست نہیں کہ ان کا واحد مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات اور سرایا کا ذکر کتبِ سیرت میں ملتا ہے۔ ان کی تعداد کے تعین میں اہلِ سیرت کے درمیان بعض اختلافات بھی

پائے جاتے ہیں۔ تاہم ان معرکوں کے اسباب، حالات اور نتائج کا جائزہ لیے بغیر محض ان کی تعداد کو اسلام کی دعوت کے مزاج کا پیمانہ قرار دینا درست نہیں۔ اسلامی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت کا بنیادی مقصد محض جنگ وقتال یا کشور کشائی نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، عدل و انصاف کے قیام اور انسانوں کی فلاح کا پیغام عام کرنا تھا۔

یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ دونوں عالمی جنگوں میں کروڑوں انسان ہلاک ہوئے، لیکن ان جنگوں کی تباہ کاریوں کو اسلام کی تاریخ کے ساتھ خلط ملط کرنا درست نہیں۔ ہر جنگ کے اسباب، حالات اور ذمہ داریوں کا تعین تاریخی شواہد کی روشنی میں ہونا چاہیے۔

رہا یہ دعویٰ کہ اسلام تلوار اور قتل وقتال کے ذریعے پھیلا، تو اس کے لیے تاریخ کے تمام شواہد کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اسلام میں دعوت کا بنیادی طریقہ حکمت، موعظۂ حسنہ اور حق کی وضاحت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ (البقرۃ:۲۵۶)

اسلامی فقہ میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اور اسلامی ریاست میں ان کے حقوق و ذمہ داریوں کے احکام موجود ہیں۔ تاریخی طور پر جزیہ بعض غیر مسلم رعایا سے مخصوص شرائط کے تحت لیا جاتا تھا۔ تاہم اس نظام کی تفصیلات کو اس کے تاریخی اور فقہی پس منظر میں سمجھنا چاہیے۔

اگر معاملہ جنگ تک پہنچتا بھی تو شریعت نے جنگ کے لیے اصول وحدود مقرر کیے۔ عورتوں، بچوں اور ایسے افراد کو قتل کرنے سے ممانعت کی گئی جو جنگ میں شریک نہ ہوں۔ ان تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے جنگ کو بے قید خون ریزی کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ اس کے لیے اخلاقی اور قانونی حدود متعین کیں۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں جنگ و جدال کی غیر ضروری خواہش کی حوصلہ افزائی نہیں ملتی۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

أَحَبَّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ، وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهَمَّامٌ، وَأَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَمُرَّةُ۔ ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں، اور سب سے زیادہ موزوں نام حارث اور ہمام ہیں، جب کہ سب سے ناپسندیدہ نام حرب اور مرہ ہیں۔

اس حدیث کے آخری الفاظ میں ناموں کے معنی اور ان کے تاثر کی طرف اشارہ ہے؛ اسے بذاتِ خود جنگ کے بارے میں کوئی مستقل شرعی حکم قرار نہیں دینا چاہیے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا، تاریخِ اسلام اور سیرتِ نبوی ﷺ کے مجموعی مزاج کو نظر انداز کرنا ہے۔ اسلام کی اصل دعوت توحید، عدل، مساوات، رحمت اور انسانیت کی فلاح تھی۔ جنگی حالات میں مسلح جدوجہد کے اپنے اسباب اور احکام تھے، جب کہ دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے والی اصل قوت رسول اللہ ﷺ کی دعوت، آپ کا کردار، آپ کے صحابہؓ کا عمل اور اسلام کی پاکیزہ و عادلانہ تعلیمات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ کو محض میدانِ جنگ کے واقعات تک محدود کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

(۲) رسول اللہ ﷺ کی متعدد شادیاں

مستشرقین نے نبی کریم ﷺ کے متعدد نکاحوں کو بھی طعن و اعتراض کا نشانہ بنایا اور یہ دعویٰ کیا کہ، معاذ اللہ، آپ ﷺ اپنی شہوانی خواہشات کے پیروکار تھے۔ لیکن جب اس موضوع کا تاریخی اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تعددِ ازواج قدیم معاشروں میں معروف تھا اور سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی اقوام کے تاریخی حالات میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

تعددِ ازواج کے پسِ پشت مختلف انسانی، معاشرتی اور اجتماعی مصالح ہوسکتے ہیں، مثلاً بیوہ عورتوں کی کفالت، خاندانوں اور قبائل کے درمیان تعلقات کا استحکام اور بعض مخصوص معاشرتی حالات میں سرپرستی و تعاون کی ضرورت۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے نکاحوں کا جائزہ لیتے وقت ہر نکاح کے الگ تاریخی پس منظر اور اس سے متعلق حالات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان نکاحوں میں دینی، معاشرتی، تعلیمی اور تشریعی پہلو نمایاں ہیں؛ اس لیے ان سب کو محض ذاتی خواہش کا نتیجہ قرار دینا ایک یک طرفہ تعبیر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے مشہور نام یہ ہیں: حضرت خدیجہ، حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت ام سلمہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت صفیہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہن۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی پہلی زوجہ تھیں۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ

تقریباً پچیس سال زندگی گزاری اور ان کی وفات تک دوسری شادی نہیں فرمائی۔ آپ ﷺ کی اولاد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا باقی تمام اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھی۔ ان کے ساتھ آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی وفا، محبت اور باہمی اعتماد کی روشن مثال ہے۔ ان کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، جو بیوہ تھیں۔ اس نکاح میں ان کی سرپرستی اور گھریلو زندگی کے استحکام کا پہلو بھی نمایاں تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی واحد کنواری زوجہ تھیں۔ ان کی عمر کے حوالے سے قدیم روایات میں نکاح کے وقت چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال کا ذکر ملتا ہے، اور اسی بنا پر بعض مستشرقین اعتراض کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر گفتگو کرتے وقت متعلقہ روایات، ان کے تاریخی پس منظر اور اس عہد کے معاشرتی عرف کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بعد میں علم وفقہ کا عظیم مرکز بنیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث روایت کیں اور خصوصاً خواتین کے مسائل، خاندانی زندگی اور دینی احکام کی وضاحت میں غیر معمولی علمی خدمات انجام دیں۔

حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے شوہر خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد وہ بیوہ ہوگئیں۔ ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا، جس سے انہیں سرپرستی اور عزت وتکریم حاصل ہوئی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہ گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا اور ان کی سرپرستی فرمائی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بعد میں فقہ وحدیث کے اہم مآخذ میں شمار ہوئیں اور ان سے متعدد دینی مسائل مروی ہیں۔

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کو ام المساکین کہا جاتا تھا، کیونکہ وہ مسکینوں اور محتاجوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے لیے معروف تھیں۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کا نکاح بھی آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی کے تاریخی واقعات میں شامل ہے۔ ان کا انتقال نکاح کے چند ہی ماہ بعد ہوگیا۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، لیکن بعد میں ان کے درمیان علیحدگی ہوگئی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا۔ اس نکاح کا تعلق منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کے برابر سمجھنے کے جاہلی تصور کی اصلاح سے تھا۔ قرآن مجید نے اس واقعے کو سورۂ احزاب میں بیان کیا ہے اور واضح فرمایا ہے کہ منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹوں کے حکم میں نہیں ہوتے۔ اس طرح اس نکاح کے ذریعے ایک اہم معاشرتی اور قانونی مسئلے کی عملی وضاحت ہوئی۔

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا بنو مصطلق سے تعلق رکھتی تھیں۔ جنگ کے بعد وہ قیدیوں میں شامل ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد فرمایا اور ان سے نکاح کیا۔ اس نکاح کے نتیجے میں ان کے قبیلے کے بہت سے افراد کو آزادی ملی اور مسلمانوں اور بنو مصطلق کے درمیان تعلقات میں قربت پیدا ہوئی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش کا انتقال حبشہ ہی میں ہوگیا اور وہ ایک اجنبی ماحول میں تنہا رہ گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا، جس سے انہیں عزت، تحفظ اور سرپرستی حاصل ہوئی۔

حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ غزوۂ خیبر کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں آئیں۔ آپ ﷺ نے انہیں آزاد فرمایا اور پھر ان سے نکاح کیا۔ اس طرح انہیں آزادانہ حیثیت اور عزت و تکریم حاصل ہوئی اور وہ ازواجِ مطہرات میں شامل ہوئیں۔

حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح بھی آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی کے اہم واقعات میں سے ہے۔ اس نکاح کے ذریعے بعض قبائل کے ساتھ تعلقات میں قربت پیدا ہوئی اور دعوتِ اسلام کے لیے معاشرتی روابط کے نئے امکانات سامنے آئے۔

حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت ام سلمہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت صفیہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہن کے علاوہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں شامل ہیں۔ ان کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی میں مختلف معاشرتی، خاندانی، تعلیمی اور دینی پہلو موجود تھے۔

(باقی صفحہ نمبر ۲۱ / پر)

اصلاحِ حال

مسلم نوجوانوں کے مسائل اور اُن کا حل

محمد معاذ خان ندوی

نوجوان کسی بھی قوم وملک کا سب سے قیمتی اور متحرک سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ حال کے معمار ہی نہیں بلکہ مستقبل کے حقیقی امین ہوتے ہیں۔ قوموں کی فکری، علمی اور تہذیبی زندگی میں تازگی، حیاتِ نو اور تحرک عموماً نسلِ نو ہی کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اگر نوجوانوں کی علمی، اخلاقی، فکری اور روحانی تربیت درست اور متوازن بنیادوں پر کی جائے تو وہ معاشرے کی تعمیر وتجدید میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں؛ لیکن اگر ان کی صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا انہیں بروقت رہنمائی نہ ملے تو یہی توانائیاں بے مقصدی، فکری انتشار اور اخلاقی ونفسیاتی بحران کا شکار ہو سکتی ہیں۔

اسلام نے انسانی زندگی کے اس مرحلے، یعنی جوانی، کو خصوصی اہمیت دی ہے؛ کیونکہ جوانی محنت، جرات، ایثار اور ذمہ داری کا بہترین زمانہ ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالیں تو دعوتِ دین، حصولِ علم، دفاعِ حق اور خدمتِ خلق کے اہم میدانوں میں نوجوانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ قرآنِ کریم اصحابِ کہف کے ذکر کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

(إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى) بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ (الکہف: ۱۳)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ پختہ ایمان، صحیح تربیت اور بلند مقصدِ حیات نوجوان کو بڑے سے بڑے چیلنج کے سامنے ثابت قدم بنا سکتے ہیں۔

آج کا نوجوان مسلمان ماضی کی نسلوں کے مقابلے میں ایک پیچیدہ اور تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں زندگی گزار رہا ہے۔ عالمگیریت، انٹرنیٹ، اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا نے دنیا بھر کی معلومات، نظریات اور تہذیبوں کو چند لمحوں میں اس کی دسترس میں پہنچا دیا ہے۔ اس صورتِ حال نے جہاں علم، تحقیق اور رابطے کے نئے امکانات پیدا کیے ہیں، وہیں فکری الجھن، اخلاقی دباؤ اور نفسیاتی مسائل کو بھی جنم دیا ہے۔ اس لیے عصرِ حاضر کے نوجوانوں کے مسائل کو محض شکایت کے انداز میں نہیں، بلکہ فہم وفراست، حکمت اور ایک جامع اصلاحی منصوبے کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مسائل کے بنیادی اسباب

نوجوانوں میں پیدا ہونے والے فکری، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی مسائل کسی ایک واقعے یا سبب کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ ان کے پیچھے متعدد داخلی اور خارجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ کمزور خاندانی تربیت، صالح نمونے کا فقدان، بے مقصد زندگی، اور بے راہ روی، تعلیمی اور معاشی دباؤ، فکری انتشار اور ذرائع ابلاغ کے غیر محسوس اثرات ان میں نمایاں ہیں۔

خاندان، تعلیمی ادارے، دینی مراکز اور بہتر اور صالح معاشرہ مل کر نوجوان کی شخصیت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اگر گھر میں محبت، شفقت اور باہمی گفتگو کا فقدان ہو، تعلیمی ادارے صرف امتحانات، نمبروں اور ڈگریوں کی دوڑ تک محدود رہیں، اور دینی مراکز نوجوانوں کے جدید سوالات کا حکمت اور دلیل سے جواب دینے کے بجائے صرف ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ پر اکتفا کریں تو نوجوانوں کے اندر ایک شدید فکری اور تربیتی خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

بے مقصدی بھی ایک خطرناک مسئلہ ہے۔ جو نوجوان یہ نہیں جانتے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، اس کی ترجیحات کیا ہیں اور معاشرے کے لیے اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں، وہ عموماً وقت کے ضیاع، ظاہری نمود ونمائش اور بے فائدہ مشاغل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، واضح اور بلند مقصد حیات رکھنے والا نوجوان اپنی صلاحیتوں، وقت اور توانائی کو مثبت کاموں میں صرف کرتا ہے۔

نوجوانوں کے مسائل کو سمجھتے وقت صرف انفرادی کمزوریوں پر توجہ دینا کافی نہیں۔ معاشی عدمِ استحکام، تعلیمی مواقع کی کمی، روزگار کا بحران، خاندانی تنازعات، گھریلو مسائل اور سماجی ناانصافی بھی نوجوانوں کی ذہنی اور عملی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے اصلاح کا عمل فرد کے ساتھ ساتھ خاندان، ادارے اور معاشرے کی سطح پر بھی ہونا چاہیے۔

فکری انتشار اور ڈیجیٹل دنیا

عصرِ حاضر کا نوجوان روزانہ معلومات کے ایک وسیع سیلاب اور متضاد خیالات سے گزرتا ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں حق وباطل، سچ اور افواہ، مستند علم اور گمراہ کن معلومات کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر نوجوان میں تحقیق، تجزیہ اور تنقیدی فکر کی صلاحیت موجود نہ ہو تو وہ ہر

مقبول یا پرکشش بات کو درست سمجھنے لگتا ہے۔

اس مسئلے کا حل نوجوانوں کو جدید دنیا اور ٹیکنالوجی سے کاٹ دینا نہیں، بلکہ انہیں باشعور اور ذمہ دار بنانا ہے۔ انہیں یہ بتانے اور سکھانے کی ضرورت ہے کہ ہر خبر پر فوراً یقین نہ کریں، ہر رائے کو دلیل کی بنیاد پر پرکھیں، ہر معلومات کے ماخذ کو دیکھیں اور محض مقبولیت یا وائرل ہونے کو حق کا معیار نہ سمجھیں۔

ٹیکنالوجی بذاتِ خود بری چیز نہیں۔ اسے تعلیم، سائنسی تحقیق، دعوت، مثبت رابطے، تخلیق اور روزگار کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سوشل میڈیا کا استعمال ضرورت کی حد سے بڑھ کر عادت یا ذہنی انحصار بن جائے، یا نوجوان بغیر کسی احتیاط کے ہر قسم کا مواد دیکھنے اور پھیلانے لگے۔

اس لیے نوجوانوں کو ٹیکنالوجی کے اخلاقی اور متوازن استعمال کی تربیت دینی چاہیے۔ انہیں صرف دوسروں کا مواد دیکھنے والا نہیں، بلکہ علمی، ثقافتی اور اصلاحی مواد تخلیق کرنے والا بھی بنانا چاہیے۔ انٹرنیٹ کو مطالعے، ہنر سیکھنے، تحقیق، مثبت رابطے اور خدمتِ معاشرہ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نوجوانوں کی آن لائن حفاظت محض پابندیوں سے ممکن نہیں؛ اس کے لیے والدین، اساتذہ کرام، پالیسی سازوں اور ٹیکنالوجی کے اداروں کی مشترکہ کوشش ضروری ہے۔

نفسیاتی دباؤ، تنہائی اور تربیت

جدید آسائشوں اور سوشل میڈیا کے وسیع روابط کے باوجود آج بہت سے نوجوان تنہائی، بے چینی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں۔ تعلیم میں مسابقت، روزگار کی جدوجہد، معاشی ناہمواری، مستقبل کے خدشات اور خاندانی تعلقات میں کشیدگی ان کی ذہنی صحت کو متاثر کرسکتی ہے۔

ایسے حالات میں نوجوان کو ایک ایسے ہمدرد اور سمجھدار رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی بات بغیر فوری تنقید کے سن سکے، اس کے جذبات کا احترام کرے اور حکمت و شفقت کے ساتھ رہنمائی کرے۔ محض ڈانٹ ڈپٹ، الزام تراشی یا اس کی مشکلات کو معمولی قرار دینے سے حالات بہتر نہیں ہوتے، بلکہ بعض اوقات مزید بگڑ جاتے ہیں۔

نوجوانوں کی نگہداشت میں دینی اور تعلیمی رہنمائی کے ساتھ نفسیاتی اور سماجی مدد بھی شامل ہونی چاہیے۔ خاندان اور تعلیمی اداروں کو ایسا محفوظ اور دوستانہ ماحول فراہم کرنا چاہیے جہاں نوجوان اپنے مسائل کھل کر بیان کرسکیں۔ ہر نفسیاتی الجھن کو فوراً ایمان کی کمزوری قرار دینا درست نہیں؛ دینی رہنمائی انسان کو مقصد، امید اور اندرونی قوت عطا کرتی ہے، لیکن شدید ذہنی دباؤ کی صورت میں ماہرِ نفسیات یا تربیت یافتہ مشیر سے مدد لینا بھی ضروری ہے۔

تربیت محض زبانی نصیحتوں اور طویل تقریروں سے حاصل نہیں ہوسکتی، بلکہ عملی نمونے کا اس میں بنیادی کردار ہے۔ نوجوان الفاظ سے زیادہ کردار سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے والدین میں سچائی، اساتذہ میں اخلاص، علماء میں تواضع اور داعیانِ دین میں حسنِ اخلاق دیکھتے ہیں تو یہ اوصاف ان کے دلوں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑتے ہیں۔

اسی لیے والدین، اساتذہ اور دینی اور مذہبی رہنماؤں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ نوجوانوں کی تربیت ایک حساس اور عظیم ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے سختی کے بجائے حکمت، نرمی، صبر، مسلسل گفتگو اور اپنے کردار کے عملی نمونے کی ضرورت ہے۔

ایمان، شناخت اور مستقبل

ایمان نوجوان کو زندگی کا مقصد عطا کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ سے جوڑتا ہے اور اس کے اندر ذمہ داری اور خود احتسابی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

(أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ)

یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (الرعد: ۲۸)

تاہم نوجوانوں کی دینی تربیت صرف چند عبادات تک محدود نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس میں اخلاق، علم، عمل، محنت اور خدمتِ خلق بھی شامل ہونی چاہیے۔ حقیقی ایمان انسان کو دنیا سے کاٹتا نہیں، بلکہ اسے معاشرے کے لیے زیادہ نفع بخش، بااخلاق اور ذمہ دار بناتا ہے۔

آج مسلمان نوجوان کے سامنے ایک بڑا چیلنج اپنی اسلامی شناخت کو محفوظ رکھتے ہوئے جدید علوم اور سائنسی و تکنیکی ترقی سے فائدہ اٹھانا ہے۔ شناخت کی حفاظت کا مطلب دنیا سے الگ تھلگ ہوجانا نہیں، اور جدید دنیا سے جڑنے کا مطلب اپنے دین، اخلاق اور ثقافت سے دستبردار ہونا بھی نہیں۔

صحیح راستہ یہ ہے کہ نوجوان اپنے دین، قرآن، سیرت اور تاریخ سے گہرا تعلق رکھیں، اور ساتھ ہی جدید علوم، زبانوں، ٹیکنالوجی اور سائنسی مہارتوں میں بھی آگے بڑھیں۔ یہی توازن انہیں نہ ماضی کے خول میں بند رہنے دے گا اور نہ کسی دوسری تہذیب کا اندھا مقلد بنائے گا۔

نوجوانوں کا مستقبل علم اور عمل کے بغیر مضبوط نہیں ہوسکتا۔ عصرِ حاضر کے چیلنجز ایسے نوجوانوں کا تقاضا کرتے ہیں جو محض نظریاتی معلومات کے حامل نہ ہوں، بلکہ عملی مہارتیں بھی رکھتے ہوں۔ سائنسی اور تکنیکی شعبوں، طب، انجینئرنگ، قانون،

معیشت، انتظامیہ، ابلاغ اور دیگر ضروری میدانوں میں نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

تعلیم کو صرف ڈگری تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اسے عملی زندگی اور معاشی استحکام سے جوڑا جائے۔ پیشہ ورانہ تربیت، ڈیجیٹل مہارتیں، کاروباری منصوبے اور فنی تعلیم نوجوانوں کو خود کفیل اور بااعتماد بناتے ہیں۔

نوجوان محض آنے والے کل کا انتظار کرنے والی نسل نہیں، بلکہ آج کا فعال حصہ بھی ہیں۔ وہ رضا کارانہ خدمت، بچوں کی تعلیم، ضرورت مندوں کی مدد، علمی و تحقیقی منصوبوں اور رفاہی کاموں کے ذریعے معاشرے کی فوری خدمت کر سکتے ہیں۔

انہیں ہر سطح پر قیادت کے حقیقی مواقع بھی ملنے چاہییں۔ قیادت صرف منصب یا شہرت کا نام نہیں، بلکہ قابلیت، اخلاق، فیصلہ سازی، نظم وضبط اور اجتماعی کام کی صلاحیت کا نام ہے۔ صرف جذبات اور جوش کافی نہیں؛ علم، اخلاق اور بصیرت کے ساتھ کام کرنا بھی ضروری ہے۔

عملی اصلاحی لائحہ عمل

نوجوانوں کے مسائل کا حل کسی ایک فرد یا ادارے کے بس کی بات نہیں۔ خاندان، تعلیمی اداروں، مساجد و مدارس، سماجی تنظیموں اور ذرائع ابلاغ کو مل کر اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

گھروں میں محبت، اعتماد اور باہمی گفتگو کی فضا قائم کی جائے۔ والدین اپنے بچوں کی بات سنیں، ان کی دلچسپیوں اور مشکلات کو سمجھیں اور دوست بن کر ان کی رہنمائی کریں۔ تعلیمی ادارے محض امتحانی کامیابی کے بجائے شخصیت سازی، تنقیدی فکر، تحقیق، اخلاقیات، قیادت اور عملی مہارتوں پر توجہ دیں۔

☆☆☆

بقیہ: سیرتِ نبوی ﷺ پر مستشرقین کے اعتراضات

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر بھی اس ضمن میں ضروری ہے۔ وہ مصر کے حاکم کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجی گئی تھیں اور ان سے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ تاہم جمہور اہلِ سیرت کے نزدیک وہ ازواجِ مطہرات میں شمار نہیں ہوتیں، بلکہ امِ ولد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس لیے ازواجِ مطہرات کی تعداد بیان کرتے ہوئے ان کا نام گیارہ ازواج کی فہرست میں شامل کرنا درست نہیں۔

پس ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے حالات پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نکاحوں کے پسِ پشت مختلف دینی، معاشرتی، تعلیمی اور تشریعی مصالح کارفرما تھے۔ ان میں بیوہ خواتین کی کفالت، قبائل کے ساتھ تعلقات کا استحکام، معاشرتی رسوم کی اصلاح اور امت تک دینی احکام کی ترسیل جیسے اہم پہلو شامل تھے۔ یہی وہ حقائق ہیں جنہیں سمجھے بغیر تعددِ ازواجِ نبوی ﷺ کے بارے میں کیا جانے والا اعتراض یک طرفہ اور تاریخی پس منظر سے بے نیاز دکھائی دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے تعددِ ازواج کی حکمتوں اور مصالح کو مختصراً درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) بیوہ خواتین کی دادرسی اور کفالت:

بعض ازواجِ مطہرات بیوہ تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے نکاح سے انہیں عزت، تحفظ اور سرپرستی حاصل ہوئی۔

(۲) تعلیم وتشریع کا فریضہ:

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے رسول اللہ ﷺ کی خانگی زندگی، عبادات، اخلاق اور گھریلو معاملات سے متعلق احادیث و احکام امت تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بالخصوص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی علمی خدمات نمایاں ہیں۔

(۳) قبائل کے ساتھ تعلقات کا استحکام:

بعض نکاحوں کے ذریعے قبائل کے ساتھ تعلقات میں قربت پیدا ہوئی اور دعوتِ اسلام کے لیے سازگار ماحول فراہم ہوا۔

(۴) جاہلی رسوم کی اصلاح:

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کے ذریعے منہ بولے بیٹے سے متعلق جاہلی تصور کی اصلاح کا ایک اہم پہلو سامنے آیا۔

(۵) معاشرتی اور دینی رہنمائی:

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے خواتین کے دینی مسائل کی وضاحت، احادیث کی روایت اور اسلامی معاشرت کی تعلیم میں نمایاں کردار ادا کیا۔

یہ اور اس طرح کے دیگر شبہات جو سیرتِ نبوی ﷺ کے خلاف اٹھائے جاتے ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ نوجوان نسل انہیں گہری بصیرت، صحیح فہم اور علمی دیانت کے ساتھ سمجھے، معتبر تاریخی مصادر اور شریعت کی روشنی میں ان کا جائزہ لے اور ان کے مدلل جوابات تشنۂ حقیقت لوگوں تک پہنچائے۔ اس طرح اسلام اور اس کی عظیم تعلیمات پر نوجوان نسل کا اعتماد مزید مستحکم ہوسکتا ہے اور امت ایک بار پھر اسلام کی تعلیماتِ رحمت وعدل سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے سعادت، اطمینان اور طمانیت کی زندگی بسر کرسکتی ہے۔

☆☆☆

تاریخ وتذکرہ

ہندوستان میں مسلم تہذیب کے عروج وزوال کا اثر

ڈاکٹر محمد عابد کریم (اسسٹنٹ پروفیسر جنتا کوشی کالج، دربھنگہ)

ہندوستان میں باہر سے جو مسلمان آئے وہ عرب تاجر، عرب فاتح، مبلغین اسلام اور ترک فاتح تھے۔ مسلمان ہونے کے باوجود یہ چاروں گروہ الگ الگ خصوصیات اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ چنانچہ اپنی مخصوص صلاحیتوں کے اعتبار سے انہوں نے اس ملک کی مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی پر اثر ڈالا۔ اسلام میں مذہب کا دائرہ عقائد وعبادات میں محدود نہیں، وہ باہمی تعلقات، حقوق وفرائض اور معاشرت وتمدن پر حاوی ہے اور اس لئے بھی کہ مذہب کو اگر تمدن و معاشرت سے، اور تمدن و معاشرت کو مذہب سے الگ کردیا جائے تو مذہب بے اثر، محدود اور کمزور اور تمدن و معاشرت شتر بے مہار اور خواہشات ومفادات کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

مسلم تہذیب شہری تہذیب تھی۔ اور مسلمان شہری زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں سے پہلے موریہ عہد اور گپتا عہد میں بڑے بڑے شہر موجود تھے اور بات بھی حقیقت میں یہی ہے کہ کسی بھی تہذیب کے بننے کے لئے شہروں کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہندوؤں کا نصب العین یا آئیڈیل ایسی زندگی ہے جو شہر سے دور بسر ہو۔ شور شرابے، خاک دھول اور دنیاداری سے دور، ایسی جگہ پر جہاں کوئی آرام سے رہ سکے اور کچھ وچار بچار کر سکے۔ مذہبی رُشد وہدایت شہروں کے شوروغل اور گردوغبار میں نہ دی جائے۔ جیسا کہ ایک قول ہے کہ ''شہروں میں ویدوں کا مطالعہ کرنا یا انہیں آواز سے پڑھنا نہیں چاہئے''۔ بڑھاپے میں وَن پرست، سنیاس اور جنگل میں رہنے کو قابل تعریف سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ہندوؤں میں مذہبی خیال کے لوگوں کا رجحان شہروں سے دور رہنے کی طرح ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں مذہبی زندگی کی نمایاں علامت مسجد ہے۔ اور قابل تعریف یہ سمجھا جاتا ہے کہ باجماعت نماز ادا کی جائے اور جماعت یعنی تعداد جتنی بڑی ہوتی ہے اتنا ہی اپنے مذہب کا احساس رہتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوؤں کا مذہبی رجحان شہرسازی کے خلاف رہا ہے اور مسلمانوں کا شدت سے شہرسازی کی طرف۔ ہندستان میں خاص طور پر پہلی دو یا تین صدیوں میں مسلمان ایک برادری کی طرح صرف شہروں ہی میں رہ سکتے تھے اور ان کے حکمراں طبقے کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو یہ خیال رہے کہ وہ ان کے حاکم ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کی حکومت کے دور میں شہروں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور وہ بہت بڑے بڑے بھی ہوگئے لیکن بڑے بڑے اور اہم شہروں میں سے کسی میں بھی نہ تو مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ تھی نہ وہ اقتصادی اعتبار سے زیادہ خوشحال تھے۔ البتہ شہرسازی کو اس طرح ہندستانی زندگی کو مسلمانوں کی ایک دَین کہا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں فن تعمیر کو جو فروغ ہوا اس کے بے شمار شاہکار سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ملک کے لئے باعث فخر ہیں۔ عمارتی فن تعمیر کے عالموں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں جو تبدیلی اس فن میں ہوئی وہ یہ تھی کہ اس میں سنگ تراشی اور بت تراشی کی بجائے عمارت سازی کی کیفیت آگئی اور ساخت کے اعتبار سے اس میں عمودیت کی بجائے اُفقیت آگئی۔ ایک طرز دوسری طرز میں بدلتی چلی گئی۔ لیکن دلی کی قطب مینار دونوں طرزوں کے بے ساختہ ایک دوسرے سے مل جانے کی عمدہ مثال ہے۔ بعد میں بنگال، گجرات اور فتحپور سیکری میں خاص مسلمانی طرز اور خاص ہندوانی طرز کے خوش نما امتزاج کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ یادگار عمارتی اور گھریلو فن تعمیر میں اینٹ پتھر اور چونے گارے کے مسالے کو بطور فن اور بطور تکنیک بڑے پیمانے پر استعمال کیا جانے لگا۔ اور ہندو اور مسلمان اسے اپنے اپنے مقاصد کے لیے اپنے اپنے ڈھنگ سے استعمال کرنے لگے۔ اندرونِ ملک کے کسی بھی شہر کے پرانے حصوں کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ شہرسازی کے عمل کے ساتھ ساتھ کس کس طرح گھریلو فن تعمیر کے نئے نئے اسٹائل بنتے گئے۔ اور یہ بھی اندازہ

ہوگا کہ یہ گھریلو فنِ تعمیر ایک مشترکہ طرز زندگی کے مخصوص عناصر کا نمائندہ ہے۔

کلچر یا تہذیب کے فروغ میں سیاسی تنظیم یا اقتدار سے جو مدد ملی اس میں شاید سب سے بڑی دَین اکبر کا منصب داری سسٹم یا نظام تھا اور اس کے قواعد وضوابط تھے۔ ان کی رو سے حکومت کے ہر افسر کو یہ حق تھا کہ وہ اپنے مذہب پر پابند رہے اور اس کی رسوم وآداب برتے اگرچہ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ہندو افسر اپنے سے اعلیٰ مسلمان افسروں کے ساتھ تعلقات میں ذات پات کے اصول اور رواج برت سکتا تھا۔ اس کے علاوہ شمالی ہندستان میں تہذیبی آداب و اطوار میں جو چمک دمک اور نزاکت ولطافت نظر آتی ہے وہ زیادہ تر دربار اور منصب داروں کی وجہ سے ہے جن کے ذریعے معاشرت کے آداب خود ان کے اپنے اور دوسرے خوشحال گھرانوں میں اپنا لیے جاتے تھے۔ اور مہذب اطوار کے نمونوں کا کام کرتے رہے۔

ضرورتوں بھری شائستہ زندگی صریحی طور پر اس زندگی سے بہتر تصور کی جاتی تھی جس میں خواہشات مختصر ہوں۔ صنعت وحرفت کی ایسی دلفریب چیزیں یا مصنوعات بنانا جو زیادہ سے زیادہ غلط سلط ضرورتوں اور شوقوں کو پورا کرسکیں۔ تہذیب کی خاص نشانیاں بن گئیں اور اس کے نتیجے کے طور پر قسم قسم کے دلپذیر چھوٹے بڑے برتن، سجاوٹ اور روزانہ استعمال کی چیزیں، تانبے، پیتل اور چاندی سونے کے زیورات کی شکل میں آج بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ پارچہ بافی یا کپڑا بنانے میں اور قالین غالیچوں پر بھی ڈیزائنوں میں بہت تنوع آ گیا۔ ہر قسم کی عمدہ مصنوعات کی مانگ بڑھ گئی۔ اتنی کہ ایک جوڑی جوتی کی قیمت پچاس ہزار روپے تک پہنچ گئی۔ پہننے اوڑھنے کے کپڑے بنانے کے مختلف سازوسامان کے ناموں کی ابتدا کا لسانیاتی سراغ لگائیں تو ایسی بہت دلچسپ بصیرت آموز باتیں معلوم ہوں گی کہ اسلام کے ہندستان میں آنے سے اقتصادی اور سماجی اعتبار سے کیا کیا ترقیاں ہوئیں۔

سنسکرت میں درزی کے لئے لفظ تو ہے۔ لیکن مسلمانوں کے آباد ہونے سے پہلے درزیوں کے موجود ہونے کی کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے پتہ چلے کہ وہ کسی زمانے میں عام طور پر اپنے کام میں مصروف رہتے ہوں۔ مرد اور عورتیں سب کپڑے کو اپنے جسم پر اس طرح ڈال لیتے تھے کہ وہ خوشنما معلوم ہو یا جسم پر وہاں باندھ لیتے تھے جہاں صرف ڈال لینے سے کام نہ چلے۔ ہوسکتا ہے کہ درزی ہوتے ہوں لیکن ان کے بغیر بھی کام چلایا جاسکتا تھا۔ برخلاف مسلمانوں کے کہ درزی اور اُس کی کاریگری کے بغیر دن میں اپنی پانچ وقت کی نماز بھی ادا نہیں کرسکتے اور مسلمان عورت کے تو تمام حقوق اور حیثیت ہی ختم ہوجائے اگر درزی اس کے کپڑے اس طرح نہ سیے کہ اس کی پوری کلائیاں، گردن، ٹخنے تک ڈھک جائیں۔ شرافت کا معیار حکمراں مقرر کرتے تھے۔ اور غیر مسلم عورتوں کو درزیوں سے کام لیکر اور کم سے کم سلے ہوئے کپڑے پہن کر شرافت کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔

سماجی تبدیلی پر غور کرتے ہوئے یہ بنیادی حقیقت ہمیں یاد رکھنی چاہئے کہ ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جو باہر سے آئے اور ان میں بھی سب کے سب اپنے خاندان سمیت نہیں آئے ہوں گے۔ یقیناً بہت بڑی تعداد ان کی ہوگی جو یہیں کے ہوں گے اور انہوں نے مذہب تبدیل کرلیا ہوگا۔ تیرہویں صدی میں شمالی ہندستان میں ہندستانی مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے ہوگئی تھی یقیناً کئی عوامل کارفرما رہی ہوں گی ان میں یہ دو زبردست عوامل تو ضرور کارفرما رہے ہوں گے۔ ایک تو مسلمان صوفیوں کی کراماتی طاقت پر یقین اور دوسرے اُس ماحول میں رہنے کی خواہش جس میں مسلمانوں کی طاقت یا اقتدار زیادہ ہو۔ لیکن یہاں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہندومت کے بدلے اسلام قبول کرلینا تو چند لمحوں کی بات ہوتی ہوگی لیکن نومسلموں کے ہندو طرزِ زندگی کے بدلے اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرلینے میں صدیاں لگ گئیں۔ اور یہ تھا وہ عمل جس کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم ورواج، خاص طور پر وہ جو شادی بیاہ اور زچگی کے موقعوں سے متعلق ہیں۔ ان کا غور سے مطالعہ کرنے سے غالباً یہ بات سامنے آئے گی کہ مسلمانوں پر اسلامی اصولوں اور عمل کے مقابلے میں ہندوؤں کے رسم و رواج اور تصورات کا کہیں زیادہ اثر تھا۔

عورتوں کو الگ تھلک رکھنا جسے پردے کا رواج بھی کہتے ہیں۔ اس کی باقاعدہ ابتدا مسلمانوں سے ہوئی۔ تُرک عورتیں بُرقع اوڑھ کر شہسواری کرتی تھیں۔ فیروز تغلق کا حکم موجود

ہے کہ عورتیں اکیلی شہسواری نہ کیا کریں۔ اکبر نے کوتوال کے لئے یہ فرض کر دیا تھا کہ دیکھے کہ عورتیں شہسواری نہ کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ طبقوں میں علیٰحدگی یا پردہ ایک معمول بن گیا اور زیادہ سخت ہوتا گیا۔ قصبات میں نچلے طبقوں میں بھی اسے شرافت کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ ہندوؤں میں اس کا چلن کہاں اور کس حد تک ہوا اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف علاقوں اور قصبات میں اس کا چلن کم یا زیادہ ہونے کا دارومدار اس بات پر تھا کہ کسی علاقے اور قصبے میں اعلیٰ طبقوں کے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کا کتنا اثر ہے۔ اس طرح معاشرتی اعتبار سے اس عمل نے مسلم کمیونٹی کی کم از کم آدھی آبادی کی کارکردگی کم کر دی۔

دوسری طرف صورت یہ تھی کہ ہندو تصورات کے سرایت کر جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں عورتوں کی وہ حیثیت بھی کم ہوگئی جو مسلم قانون کی رو سے انہیں دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر بیوہ جس کی شادی کی اُس کے سرپرستوں پر اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی ان کی اپنی کنواری بیٹیوں کی۔ اس کا یہ حق مر گیا اور انیسویں صدی کے اوائل میں مصلح اور دینی پیشوا حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کی اصلاحی تحریک کے ذریعے ہی اسے آہستہ آہستہ بحال کیا جاسکا۔

جہیز اور تلک مسلمانوں میں نئی عادت ہے۔ جو غالباً برادرانِ وطن کی دَین ہے۔ غالباً اس کی بنیادی وجہ بھی وہی ہے جو ان کے یہاں ہے۔ یعنی لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہ دینا جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ حالاں کہ دیگر شرعی ورثاء کی طرح لڑکیوں کو بھی ان کے شرعی حصے کے مطابق وراثت دینا ضروری ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اس کو فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ اس فریضے کا ترک عام طور پر ہو رہا ہے۔ جس کی ایک نقد سزا مسلمانوں کو بعید نہیں کہ جہیز اور تلک کے عذاب کی شکل میں مل رہی ہے۔

لہٰذا اگر داماد اور اس کے اہل خانہ کو اطمینان دلا دیا جائے کہ وراثت کے پورے مال میں لڑکی کا حصّہ لگا یا گیا ہے تو ان شاء اللہ جہیز کا مطالبہ چھوڑ کر اس حق وراثت پر راضی ہو جائے گا۔ ''جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے مضرتوں سے نجات کی شکل نکال دیتا ہے''۔ (الطلاق:۲)

فیشن اور اسٹائل میں مسلم عورتیں بھی ساڑی کے ساتھ اس طرح کا بلاؤز (Blouse) پہنتی ہیں کہ پیٹ کھلا رہتا ہے۔ اور لڑکیاں جینس اور ٹی شرٹ پہنتی ہیں جبکہ لباس ایسا پہننا چاہئے جو شرم وحیا، غیرت وشرافت اور جسم کی ستر پوشی اور حفاظت کے تقاضوں کو پورا کرے اور جس سے تہذیب وسلیقہ اور زینت وجمال کا اظہار ہو۔ قرآن پاک میں خدا تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''اے اولاد آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے زینت اور حفاظت کا ذریعہ بھی ہو۔'' (الاعراف:۲۶)

مورتی کا پوجا کرتے ہوئے دیکھتے دیکھتے مسلمانان ہند نے بھی مختلف شکلوں میں شرک کا آغاز کر دیا ہے۔ مورتی کی تصویر اور پھر مورتی اپنے گھروں میں رکھنے لگے ہیں جب کہ ارشادِ ربانی ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ بڑے جرم کا مرتکب ہے۔'' (النساء:۴۸)

ہندستان میں مسلم تہذیب اس وقت تک طاقتور اور مؤثر رہی جب تک فطری اصول کہ ''انسان دیتا رہے گا یا لیتا رہے گا'' کے مطابق دعوت واشاعت اسلام اور اعلیٰ تہذیب کی تشکیل کا کام کرتے رہے اور مسلم تہذیب اس وقت کمزور پڑ گئی اور متاثر ہونے لگی جب مسلمانوں نے اس حکمت کو نظر انداز کر دیا۔ تہذیب وافکار کی اندھی تقلید کی مذمت کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ ہر قوم کے لئے عار کی بات ہے اور اس قوم کے لئے ناقابل معافی گناہ ہے جو قوموں کی قیادت اور عالمی انقلاب کے لئے پیدا کی گئی:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

اسلام کو بطور مذہب باقی رہنا ہے ہی، ضرورت اسلام کو معاشرے تہذیب اور اس کے سماجی ومعاشی اور سیاسی اداروں کی شکل میں، عہد حاضر میں قائم کرنا ہے۔ اور زمانہ کا مجدد کہلانے کا مستحق وہ ہوگا جو اسلامی قوانین وتہذیب کی برتری ثابت کرنے کے لیے میدان میں آئے۔

☆☆☆

علم وھدایت

علم کی عظمت اور اُمت کی فکری تعمیر

ڈاکٹر مفتی سہیل ندوی (حیدرآباد)

انسانی تہذیب کی پوری تاریخ پر اگر غیر جانب دارانہ نگاہ ڈالی جائے تو ایک حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دنیا میں وہی قومیں سربلند رہیں جنہوں نے علم کو اپنا سرمایہ، قلم کو اپنا ہتھیار اور اخلاق کو اپنی شناخت بنایا۔ طاقت کی سلطنتیں چند صدیوں میں بکھر گئیں، دولت کے انبار وقت کی گرد میں گم ہو گئے، لیکن علم کی روشنی کبھی بجھ نہ سکی۔ سقراط کا فلسفہ، ارسطو کی منطق، امام غزالی کی حکمت، ابن خلدون کی عمرانی بصیرت، شاہ ولی اللہ دہلوی کی اصلاحی فکر اور علامہ اقبال کا پیغام آج بھی زندہ ہے، کیونکہ علم کی عمر افراد سے کہیں زیادہ طویل ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ مجید نے نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا: ''کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟'' اس مختصر سوال میں پوری انسانی تاریخ کا خلاصہ پوشیدہ ہے کہ عزت، قیادت اور ترقی کا اصل معیار علم ہے، نہ کہ نسب، دولت یا اقتدار۔

اسلام کا آغاز ہی قلم اور علم کے اعلان سے ہوا۔ دنیا کے کسی مذہب یا تہذیب نے اپنی پہلی دعوت کا آغاز علم سے نہیں کیا، مگر قرآنِ مجید کی پہلی وحی ''اقرأ'' سے شروع ہوتی ہے۔ گویا اسلام نے سب سے پہلے انسان کے ذہن کو بیدار کیا، اس کی فکر کو روشن کیا اور اسے بتایا کہ جہالت غلامی ہے، جبکہ علم آزادی کا دوسرا نام ہے۔ یہ محض ایک مذہبی حکم نہیں بلکہ پوری انسانی تہذیب کے لیے ایک ابدی منشور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی کو صرف عبادت گاہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک عظیم علمی مرکز میں تبدیل کر دیا، جہاں قرآن کی تعلیم بھی تھی، حکمت کی مجلسیں بھی تھیں، معاشرتی تربیت بھی تھی اور ریاستی منصوبہ بندی بھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب مسلمان قرآن کے اس پیغام سے وابستہ رہے تو بغداد، قرطبہ، دمشق، قاہرہ، سمرقند، بخارا، دہلی اور لکھنؤ جیسے شہر علم و تحقیق کے عالمی مراکز بن گئے۔ یورپ اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، جبکہ مسلم دنیا کی لائبریریاں لاکھوں کتابوں سے مزین تھیں۔ اندلس کی جامعہ قرطبہ، جامعہ زیتونہ، جامعہ ازہر اور نظامیہ بغداد صرف درسگاہیں نہیں تھیں بلکہ تہذیب ساز ادارے تھے، جہاں فلسفہ، طب، فلکیات، ریاضی، ادب، فقہ، حدیث اور زبان و بیان کے علوم یکجا پڑھائے جاتے تھے۔ مسلمان عالم جب کسی مسئلے پر قلم اٹھاتا تھا تو اس کی تحریر صرف اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ آنے والی صدیوں کے لیے رہنمائی کا سرمایہ بن جاتی تھی۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ آج امتِ مسلمہ کی بڑی تعداد نے علم کے بجائے معلومات کو علم سمجھ لیا ہے۔ سوشل میڈیا کی چند سطریں، مختصر ویڈیوز اور سطحی مباحث نے مطالعے کی عادت کو کمزور کر دیا ہے۔ کتاب سے تعلق کمزور ہوتا جا رہا ہے، جبکہ تحقیق، تنقید اور تجزیے کی روایت بھی محدود ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ علم کا تعلق صرف معلومات جمع کرنے سے نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے، دلائل کا جائزہ لینے اور صحیح و غلط میں امتیاز پیدا کرنے سے ہے۔ ایک پڑھی ہوئی کتاب انسان کو صرف معلومات نہیں دیتی بلکہ اس کی شخصیت، اس کی زبان، اس کی سوچ اور اس کے کردار کو بھی سنوارتی ہے۔

ادیب اور مفکر دراصل قوم کی اجتماعی عقل ہوتے ہیں۔ جب معاشرے میں قلم خاموش ہو جائے تو تلواریں بولنے لگتی ہیں، جب تحقیق ختم ہو جائے تو تعصب جنم لیتا ہے، اور جب کتابوں سے رشتہ ٹوٹ جائے تو افواہیں علم کی جگہ لے لیتی ہیں۔ اسی لیے ہر دور کے مصلحین نے سب سے پہلے فکری اصلاح کی دعوت دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن کو عوام تک پہنچایا، سرسید احمد خاں نے جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیا، علامہ شبلی نعمانی نے تحقیق کی نئی راہیں کھولیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے صحافت کو علمی وقار عطا کیا، اور علامہ اقبال نے نوجوانوں کو شاہین کی پرواز عطا کی۔ ان تمام شخصیات کا مشترکہ سرمایہ قلم تھا، اور یہی قلم قوموں کی تقدیر بدلنے کا ذریعہ بنا۔

آج ہماری سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ ہم دوبارہ کتاب سے رشتہ جوڑیں، مطالعے کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنائیں، تحقیق کی روایت کو زندہ کریں، اور نوجوان نسل کو یہ احساس دلائیں کہ قوموں کی تعمیر صرف عمارتوں سے نہیں بلکہ کتابوں سے ہوتی ہے، صرف معیشت سے نہیں بلکہ فکر سے ہوتی ہے، اور صرف نعروں سے نہیں بلکہ علم، کردار اور مسلسل محنت سے ہوتی ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر امتِ مسلمہ دوبارہ علمی قیادت حاصل کر سکتی ہے، اور یہی تعمیرِ حیات کا حقیقی پیغام بھی ہے۔

علم ہی وہ بنیاد ہے جس پر قوموں کی تہذیب،

قیادت اور بقا کی عمارت استوار ہوتی ہے۔لیکن یہ سوال اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ اگر اسلام نے علم کو اپنی پہلی دعوت بنایا تھا، اگر مسلمانوں نے ایک ہزار برس تک دنیا کی علمی قیادت کی تھی، اگر بغداد، قرطبہ، بخارا، سمرقند، دہلی اور لکھنؤ جیسے شہر دنیا کے عظیم علمی مراکز تھے، تو پھر ایسا کیا ہوا کہ یہی امت رفتہ رفتہ فکری پسماندگی، علمی جمود اور تہذیبی انحطاط کا شکار ہوتی چلی گئی؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا محض ماضی پر نوحہ خوانی نہیں، بلکہ مستقبل کی تعمیر کے لیے ناگزیر شرط ہے۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی بھی قوم کا زوال اچانک نہیں آتا، بلکہ اس کی ابتدا فکر کے انحراف سے ہوتی ہے۔ جب مطالعہ کم ہو جائے، تحقیق کا ذوق ختم ہو جائے، سوال اٹھانے کی جرأت باقی نہ رہے، اجتہادی فکر جمود کا شکار ہو جائے، اور علم محض امتحانات اور ملازمتوں تک محدود ہو جائے، تو معاشرہ رفتہ رفتہ اپنی تخلیقی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں قومیں دوسروں کی ایجاد کردہ تہذیب کی صارف تو بن جاتی ہیں، لیکن خود نئی فکر، نئی تحقیق اور نئی قیادت پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''المقدمہ'' میں بڑی بصیرت کے ساتھ لکھا ہے کہ قوموں کا عروج صرف معاشی قوت سے نہیں بلکہ علمی وفکری قوت سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب فکر زندہ رہتی ہے تو تہذیب بھی زندہ رہتی ہے، اور جب فکر مرجاتی ہے تو محلات، سلطنتیں اور وسائل بھی قوم کو بچا نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید بار بار انسان کو غور وفکر، تدبر، تعقل اور مشاہدے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کا اسلوب محض احکام سنانے کا نہیں بلکہ عقل کو بیدار کرنے کا ہے۔ کہیں فرمایا: ''کیا تم غور نہیں کرتے؟''، کہیں ارشاد ہوا: ''کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟'' اور کہیں انسان کو زمین و آسمان کے نظام میں تدبر کی دعوت دی گئی۔ گویا اسلام نے تقلید جامد کے بجائے شعوری ایمان اور زندہ فکر کی بنیاد رکھی۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں تعلیم کو بھی رفتہ رفتہ ایک تجارتی سرگرمی بنا دیا گیا۔ کامیابی کا معیار صرف ڈگری، ملازمت اور تنخواہ قرار پایا، جبکہ کردار، تحقیق، مطالعہ، تخلیق اور سماجی خدمت جیسے عناصر پس منظر میں چلے گئے۔ طلبہ کی بڑی تعداد نصاب ختم کر لیتی ہے، لیکن کتاب سے محبت پیدا نہیں ہوتی؛ امتحان پاس کر لیتی ہے، لیکن سوال کرنے کی عادت پیدا نہیں ہوتی؛ سند حاصل کر لیتی ہے، لیکن معاشرے کے مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے، مگر حکمت اور بصیرت کا چراغ روشن نہیں ہو پاتا۔

آج کی ڈیجیٹل دنیا نے اس بحران کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں معلومات تک رسائی پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو چکی ہے، لیکن اس کے ساتھ سطحیت، عجلت اور غیر مصدقہ معلومات کا سیلاب بھی آ گیا ہے۔ چند سیکنڈ کی ویڈیو کو تحقیق سمجھ لیا گیا ہے، چند جذباتی جملوں کو علم کا متبادل تصور کیا جانے لگا ہے، اور علمی اختلاف کی جگہ شور وغوغا نے لے لی ہے۔ حالانکہ علمی روایت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر دعوے کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھا جائے، ہر خبر کی تحقیق کی جائے، ہر رائے کو احترام کے ساتھ سنا جائے، اور اختلاف کو دشمنی نہیں بلکہ فکری ارتقا کا ذریعہ سمجھا جائے۔

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امتِ مسلمہ کا علمی سرمایہ آج بھی دنیا کے کسی بھی مذہب یا تہذیب سے کم نہیں۔ لاکھوں مخطوطات دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، ہزاروں علمی کتابیں آج بھی تحقیق کا سرمایہ ہیں، اور قرآن و حدیث کی صورت میں ایسا مستند علمی ذخیرہ موجود ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اس عظیم ورثے سے جوڑا جائے، اسے جدید تقاضوں کے مطابق تحقیق کا سلیقہ سکھایا جائے، اور اسے یہ اعتماد دیا جائے کہ اسلام اور جدید علوم میں کوئی تصادم نہیں، بلکہ صحیح علم ہمیشہ انسان کو اللہ کی معرفت، انسانیت کی خدمت اور کائنات کی بہتر تفہیم کی طرف لے جاتا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہمارے تعلیمی اداروں، مدارس، جامعات، لائبریریوں اور ادبی انجمنوں کو نئے جذبے کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ صرف نصابی تعلیم کافی نہیں؛ مطالعہ، مباحثہ، تحقیق، تصنیف، تنقیدی فکر اور تخلیقی اظہار کو بھی فروغ دینا ہوگا۔ جس دن ہمارے نوجوان کتاب کو اپنا دوست، قلم کو اپنا ساتھی اور تحقیق کو اپنا شوق بنالیں گے، اسی دن علمی بیداری کی نئی صبح طلوع ہوگی۔

یہی وہ علمی انقلاب ہے جس کی بنیاد پر ایک بار پھر ایسے مفکر، محقق، سائنس دان، ادیب، مفسر، محدث اور مصلح پیدا ہو سکتے ہیں جو نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمان علم کے ساتھ وابستہ ہوئے تو دنیا نے ان سے سیکھا، اور جب انہوں نے علم سے بے اعتنائی اختیار کی تو وہ دوسروں کے محتاج بن گئے۔ اس لیے آج کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ ہم اپنی فکری آزادی، علمی خود اعتمادی اور تحقیقی روایت کو دوبارہ زندہ کریں، کیونکہ یہی امت کے روشن مستقبل کی حقیقی ضمانت ہے۔

☆☆☆

ہمارا سماج

خاندانی منصوبہ بندی: ایک جائزہ

رحمت اللہ سعد ندوی

موجودہ دور میں ذرائعِ ابلاغ اور ابلاغی وسائل انسانی ذہن سازی میں غیر معمولی کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختلف نظریات اور تصورات کو میڈیا، اشتہارات، مہمات اور سماجی ذرائع کے ذریعے اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ معاشرے میں ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں کسی بھی مقبول تصور کو قبول کرنے سے پہلے اس کے پس منظر، مقاصد، فوائد، نقصانات اور طویل مدتی نتائج پر غور کرنا ضروری ہے۔

ایسے ہی تصورات میں ''خاندانی منصوبہ بندی'' بھی شامل ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے دنیا کے مختلف ممالک میں آبادی، وسائل، صحت اور معاشی ترقی کے حوالے سے خاندانی منصوبہ بندی کی مہمات چلائی جاتی رہی ہیں۔ ان مہمات کا بنیادی استدلال عموماً یہ ہوتا ہے کہ محدود وسائل، بڑھتی ہوئی آبادی اور معاشی مشکلات کے درمیان خاندانوں کو اپنی اولاد کی تعداد اور بچوں کے درمیان وقفے کے بارے میں منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ تاہم، اس موضوع کو صرف آبادی کم کرنے کے زاویے سے دیکھنا درست نہیں؛ اس کے اخلاقی، طبی، معاشی، سماجی اور آبادیاتی پہلو بھی ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' ایک ہی مفہوم رکھنے والی اصطلاح نہیں ہے۔ بچوں کی پیدائش میں مناسب وقفہ، ماں اور بچے کی صحت کا خیال، حمل کے دوران طبی احتیاط، اور میاں بیوی کا باہمی مشورے سے اپنی خاندانی ذمہ داریوں کے بارے میں فیصلہ کرنا ایک پہلو ہے؛ جب کہ محض آبادی کم کرنے کے لیے دباؤ، جبری اقدامات یا اولاد کو معاشی بوجھ سمجھنے کی ذہنیت ایک بالکل مختلف مسئلہ ہے۔ ان دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھنا درست نہیں۔

اسی لیے خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کسی بھی بحث میں ''اختیار'' اور ''جبر'' کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اگر کسی خاندان کو صحت، تعلیم، رہائش اور معاشی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی اولاد کے درمیان مناسب وقفے کے بارے میں باخبر فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے تو یہ ایک الگ نوعیت کا معاملہ ہے؛ لیکن اگر آبادی کو محض ایک مسئلہ سمجھ کر لوگوں پر مخصوص تعدادِ اولاد مسلط کی جائے تو اس کے اخلاقی اور انسانی پہلوؤں پر ضرور غور ہونا چاہیے۔

آبادی کے بارے میں دنیا میں ایک عرصے تک یہ تصور عام رہا کہ بڑھتی ہوئی آبادی لازماً وسائل کی قلت، غربت اور معاشی بحران کا سبب بنے گی۔ لیکن انسانی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ وسائل جامد نہیں ہوتے۔ علم، ٹیکنالوجی، زراعت، صنعت، تجارت اور انسانی محنت نے قدرتی وسائل کے استعمال کی صلاحیت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ ایک صدی پہلے جتنی پیداوار کسی مخصوص رقبے سے حاصل ہوتی تھی، آج بہتر بیج، آب پاشی، مشینری، کھاد اور جدید زرعی طریقوں کے ذریعے اس سے کہیں زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح صنعتی ترقی اور ٹیکنالوجی نے انسان کے لیے نئے معاشی امکانات پیدا کیے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وسائل لامحدود ہیں یا آبادی میں ہر اضافہ لازماً فائدہ مند ہوتا ہے۔ پانی، زمین، خوراک، رہائش، روزگار اور ماحول سے متعلق مسائل حقیقی ہیں اور ان کا سنجیدگی سے حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ تاہم، یہ نتیجہ بھی درست نہیں کہ ہر معاشی مشکل کا بنیادی سبب محض زیادہ آبادی ہے۔ کسی ملک کی معاشی حالت اس کے سیاسی نظام، تعلیم، صحت، حکمرانی، وسائل کی منصفانہ تقسیم، صنعتی ترقی، روزگار کے مواقع اور انسانی سرمائے سمیت متعدد عوامل سے متاثر ہوتی ہے۔

اگر کسی معاشرے میں شرحِ پیدائش طویل عرصے تک بہت کم ہو جائے تو آبادی کا عمرانی توازن متاثر ہوسکتا ہے۔ نوجوانوں کی تعداد کم اور بزرگوں کا تناسب زیادہ ہونے لگتا ہے، جس سے افرادی قوت، پنشن، صحت اور نگہداشت جیسے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ جاپان اس کی نمایاں مثال ہے، جہاں آبادی میں کمی اور عمر رسیدگی اہم قومی مسائل بن چکے ہیں۔ چین میں بھی طویل عرصے کی آبادیاتی پالیسیوں کے بعد کم شرحِ پیدائش اور عمر رسیدگی کے مسائل نمایاں ہیں؛ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۲۵ء کے اختتام پر اس کی آبادی ۱.۴۰۴۸۹ ارب تھی اور ۶۰ سال یا اس سے زیادہ عمر کے افراد کا تناسب ۲۳ فیصد تھا۔ بھارت کی مجموعی شرحِ پیدائش بھی

تقریباً ۰.۲ تک پہنچ چکی ہے، اگرچہ مختلف ریاستوں میں نمایاں فرق موجود ہے۔ اسی طرح آندھرا پردیش میں کم ہوتی شرحِ پیدائش اور بڑھتی عمر رسیدہ آبادی کے باعث ۲۰۲۴ء کے بعد آبادیاتی پالیسی پر دوبارہ توجہ دی گئی اور ۲۰۲۶ء میں زیادہ بچوں والے خاندانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مالی مراعات کی تجویز سامنے آئی۔ یہ مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ آبادی کے مسائل جامد نہیں ہوتے؛ حالات بدلنے کے ساتھ پالیسی کی ترجیحات بھی بدل سکتی ہیں۔

لہٰذا آبادی کے مسئلے کا حل نہ اندھی آبادی بڑھانے میں ہے اور نہ اندھی آبادی گھٹانے میں۔ اصل ضرورت آبادی اور وسائل کے درمیان متوازن تعلق پیدا کرنے کی ہے۔ ایسی پالیسی ہونی چاہیے جو انسان کو محض ''وسائل استعمال کرنے والے فرد'' کے طور پر نہ دیکھے، بلکہ اسے خود ایک انسانی سرمایہ تصور کرے۔ تعلیم یافتہ، صحت مند اور ہنرمند انسان کسی بھی ملک کے لیے بوجھ نہیں بلکہ اس کی معاشی اور علمی قوت بن سکتا ہے۔

یہاں دینی نقطۂ نظر بھی اہم ہے۔ اسلام انسان کو رزق کے بارے میں اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

''وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ'' (سورۃ ھود: ۶)۔

''زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو، اور وہ اس کے ٹھکانے اور اس کے سپرد کیے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔ سب کچھ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔''

یہ آیت انسان کو اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے پر یقین دلاتی ہے؛ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اسباب اختیار کرنا چھوڑ دے۔ اسلام توکل کے ساتھ تدبیر کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے معاشی مشکلات، صحت، بچوں کی پرورش، ماں کی جسمانی حالت اور خاندان کی ذمہ داریوں کو سامنے رکھ کر فیصلے کرنا اور اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اولاد کو محض معاشی بوجھ سمجھنے کی ذہنیت اختیار نہ کریں۔ ایک بچہ صرف خوراک استعمال کرنے والا فرد نہیں ہوتا؛ وہ مستقبل کا استاد، ڈاکٹر، انجینئر، کسان، صنعت کار، محقق، عالم، تاجر یا معاشرے کا خدمت گزار بھی بن سکتا ہے۔ انسانی تاریخ میں بے شمار معاشی، علمی اور تہذیبی ترقیات انہی انسانوں کی محنت کا نتیجہ ہیں جنہیں کسی زمانے میں محض ''اضافی آبادی'' سمجھا جا سکتا تھا۔

البتہ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ والدین پر اپنی اولاد کی صحت، تعلیم، تربیت اور بہتر مستقبل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس لیے اولاد کے معاملے میں جذباتی نعروں کے بجائے ذمہ داری، اعتدال، باہمی مشورے اور دینی و اخلاقی اصولوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔

ہمیں نہ یہ کہنا چاہیے کہ کثرتِ اولاد ہر حال میں خوش حالی کی ضمانت ہے اور نہ یہ کہ کم اولاد ہی خوش حالی کا واحد راستہ ہے۔ اسی طرح آبادی کو مکمل طور پر مسئلہ قرار دینا بھی درست نہیں اور اسے ہر حال میں نعمت سمجھ کر اس کے تمام عملی تقاضوں سے صرفِ نظر کرنا بھی درست نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آبادی کے مسئلے کو سیاسی نعروں اور پروپیگنڈے کے بجائے علم، تحقیق، اخلاق، مذہب، طب، معیشت اور انسانی تجربے کی روشنی میں سمجھا جائے۔ انسان کو بوجھ سمجھنے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ کی مخلوق، معاشرے کے فرد اور مستقبل کے انسانی سرمائے کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ آبادی کے توازن کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جو انسانی وقار، خاندانی استحکام، ماں اور بچے کی صحت اور معاشرتی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوں۔

آخرکار انسان کا علم محدود ہے۔ وہ آج کے وسائل کو دیکھ کر مستقبل کے تمام امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے بارہا یہ سمجھا کہ فلاں چیز محدود ہے، لیکن علم، محنت اور ٹیکنالوجی نے اس کے استعمال کے نئے راستے پیدا کر دیے۔ اس لیے مستقبل کے بارے میں خوف پھیلا کر انسان کو اپنی ہی نسل سے بدظن کرنا دانش مندی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین آباد کرنے، محنت کرنے اور اسباب اختیار کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اس کے ساتھ رزق کے بارے میں اپنے رب پر اعتماد بھی رکھنا چاہیے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داری سے فرار نہ اختیار کرے، نہ اپنی نسل کو بوجھ سمجھے اور نہ وسائل کی تقسیم اور معاشی ناانصافی کے مسائل کا سارا بوجھ صرف آبادی کے سر ڈال دے۔

آبادی مسئلہ ہو سکتی ہے، لیکن انسان بذاتِ خود مسئلہ نہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ انسان، وسائل اور معاشی نظام کے درمیان توازن کس طرح قائم کیا جائے۔

☆☆☆

راہِ نجات

جسم کی فکر، روح سے غفلت

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

ہر انسان کو اپنی زندگی سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی بقا و حفاظت کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اپنی جان کو خطرات سے محفوظ رکھنے، جسم کو صحت مند رکھنے اور زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنانے کے لیے مسلسل فکر مند رہتا ہے۔ اس کی صبح و شام، اس کی محنت و مشقت، اس کی معاشی تگ و دو اور اس کی بیشتر منصوبہ بندیوں کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ زندگی کا سلسلہ بہتر انداز میں جاری رہے، ضروریات پوری ہوتی رہیں اور مستقبل کسی بڑی پریشانی یا محرومی سے محفوظ رہے۔

یہ فکر اپنی اصل کے اعتبار سے نہ صرف فطری ہے، بلکہ انسانی زندگی کے تسلسل کے لیے ضروری بھی ہے۔ اگر انسان اپنی جان، صحت، غذا، رہائش اور حفاظت کی فکر چھوڑ دے تو اس کی زندگی کا نظام بہت جلد مشکلات کا شکار ہو جائے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی بقا کے لیے جس قدر فکر مند رہتا ہے، کیا وہ اسی قدر اپنی زندگی کے مقصد، اپنی اخلاقی ذمہ داریوں اور اپنی روحانی ضرورتوں کے بارے میں بھی حساس ہے؟ کیا اس کی تمام تر جدوجہد صرف جسم کو زندہ رکھنے کے لیے ہے، یا وہ اس حقیقت پر بھی غور کرتا ہے کہ جسم کی زندگی کے ساتھ روح کی زندگی اور آخرت کی کامیابی بھی ایک اہم حقیقت ہے؟

یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کے گرد انسانی زندگی کے بہت سے مسائل گھومتے ہیں۔ انسان اپنی مادی ضروریات کے لیے بے شمار تدبیریں اختیار کرتا ہے، مگر اکثر اپنی روحانی ضروریات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ جسم کی غذا کا اہتمام کرتا ہے، لیکن روح کی غذا سے غافل رہتا ہے؛ جسمانی بیماری کے علاج کے لیے ماہرین سے رجوع کرتا ہے، لیکن اخلاقی اور روحانی بیماریوں کے علاج کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔

انسان کی یہ جدوجہد صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ اپنے اہل و عیال، بچوں اور متعلقین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی فکر مند رہتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم، ان کی صحت، ان کے مستقبل اور ان کی آسائش کے لیے محنت کرتا ہے۔ ان کے لیے بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کرنا چاہتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

"وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" [القصص: ۷۷] (اور جو کچھ اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، اس کے ذریعے آخرت کا گھر تلاش کرو، اور دنیا میں سے اپنا حصہ بھی نہ بھولو)۔

اس آیت میں اسلامی تصورِ حیات کا ایک نہایت اہم اصول بیان ہوا ہے۔ اسلام انسان کو دنیا کی جائز ضرورتوں سے منہ موڑنے کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ اسے یہ سکھاتا ہے کہ دنیا کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ دنیا کی ضروریات پوری کرنا بھی مطلوب ہے، لیکن اس مقصد کے ساتھ کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجا لائے اور اپنی زندگی کو کسی بلند مقصد سے وابستہ رکھے۔

سوال یہ ہے کہ جس انسان کو اپنے جسم کی حفاظت کی اس قدر فکر ہے، کیا اسے اپنی روح، اپنے اخلاق اور اپنے کردار کی حفاظت کی بھی اتنی ہی فکر ہے؟ اگر جسم بیماری کا شکار ہو جائے تو انسان بے چین ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس کا اخلاق بگڑ جائے، دل حسد و کینہ سے بھر جائے، زبان جھوٹ اور غیبت کی عادی ہو جائے اور معاملات خیانت و بد دیانتی سے آلودہ ہو جائیں تو کیا وہ اسی قدر پریشان ہوتا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں جسمانی زندگی اور روحانی زندگی کے درمیان انسان کے رویے کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔

انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے بہت کچھ حاصل کرتا ہے، لیکن اکثر اس بات کو بھول جاتا ہے کہ دوسرے انسان بھی اسی طرح کی ضروریات رکھتے ہیں۔ اسے اپنے لیے اچھی غذا چاہیے، لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کے پڑوس میں کوئی شخص بھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لیے بہترین تعلیم چاہتا ہے، لیکن معاشرے کے محروم بچوں کی تعلیمی مشکلات سے بے خبر رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے آرام دہ مکان اور بہتر علاج کی سہولت چاہتا ہے، مگر کسی بے گھر، بیمار یا ضرورت مند انسان کی پریشانیوں پر اس کی توجہ نہیں جاتی۔

اسلام انسان کو اسی اخلاقی بلندی تک پہنچانا چاہتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے

ساتھ دوسروں کی ضرورتوں کو بھی محسوس کرے۔ اپنی زندگی کی حفاظت کرے، لیکن دوسروں کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالے؛ اپنے بچوں سے محبت کرے، لیکن دوسرے بچوں کے حقوق سے غافل نہ ہو؛ اپنی آسائش کے لیے کوشش کرے، لیکن کسی دوسرے کی محرومی کو اپنی کامیابی کی بنیاد نہ بنائے۔

انسان کی زندگی میں اخلاقی جواب دہی کا پہلو نہایت اہم ہے۔ ایک جانور اپنی فطری ضرورت کے تحت خوراک تلاش کرتا ہے، لیکن انسان کو حلال وحرام، جائز وناجائز، عدل وظلم اور امانت و خیانت کے درمیان فرق کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ انسان کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے عقل وشعور استعمال کرنے کا پابند بنایا گیا ہے۔ یہی انسان کا حقیقی امتیاز ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو بھی سمجھے۔ اس کی عظمت صرف اس میں نہیں کہ وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے تدبیریں اختیار کرتا ہے، بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

انسان اپنی جسمانی زندگی کے لیے جس قدر اہتمام کرتا ہے، اس کے مقابلے میں روحانی زندگی کے لیے اکثر کم توجہ دیتا ہے، بہت کم لوگ اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں کہ جس طرح جسم کو زندہ اور توانا رکھنے کے لیے غذا، صاف پانی، ہوا اور مناسب ماحول کی ضرورت ہے، اسی طرح انسان کی روح، اس کے اخلاق اور اس کے باطن کی نشوونما کے لیے بھی ایک خاص قسم کی غذا اور نگہداشت ضروری ہے۔

جسم کی غذا سے جسم کو قوت ملتی ہے، جب کہ روح کی غذا ایمان، ذکرِ الٰہی، عبادت، علمِ نافع، توبہ، اخلاص، حسنِ اخلاق اور نیک اعمال ہیں۔ جسمانی نشوونما کے لیے انسان کو مناسب غذا درکار ہے، جب کہ روحانی نشوونما کے لیے اسے سچائی، دیانت، حیا، صبر، شکر، توکل اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کی ضرورت ہے۔

اگر انسان جسم کو غذا فراہم کرتا رہے، لیکن روح کو اس کی ضروری غذا سے محروم رکھے، تو اس کی زندگی میں ایک بنیادی عدم توازن پیدا ہوسکتا ہے۔ ظاہری اعتبار سے وہ خوش حال ہو، اس کے پاس دولت اور آسائشیں ہوں، لیکن اس کا دل بے سکونی، حسد، حرص، تکبر اور اضطراب کا شکار ہوسکتا ہے۔

قرآن مجید اس حقیقت کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتا ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ [الرعد:۲۸] (خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں)۔

انسان کے باطن کا سکون صرف خارجی وسائل سے حاصل نہیں ہوتا۔ مادی وسائل زندگی کی سہولتیں فراہم کرسکتے ہیں، لیکن قلبی اطمینان، مقصدِ حیات کا شعور اور اللہ تعالیٰ سے تعلق ایک الگ نوعیت کی ضرورتیں ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ روحانی غذا کا مطلب جسمانی ضروریات سے بے اعتنائی نہیں۔ اسلام جسم اور روح دونوں کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو یہ سمجھانا کہ رب، نفس اور اہل وعیال سب کے حقوق ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کا اس بات کی تصدیق فرمانا، اسی توازن کی روشن مثال ہے۔ [حدیث:۱۹۶۸]

لہٰذا صحیح اسلامی فکر یہ ہے کہ جسم کی حفاظت بھی ہو، روح کی تربیت بھی؛ دنیا کی ضروریات بھی پوری ہوں، آخرت کی تیاری بھی؛ جسمانی قوت بھی برقرار رہے اور اخلاقی و روحانی قوت بھی کمزور نہ پڑے۔

انسان کی زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ فانی جسم کی حفاظت کے لیے تو مسلسل فکرمند رہتا ہے، لیکن اس روحانی زندگی کی تیاری کے سلسلے میں اتنی توجہ نہیں دیتا جس کی اہمیت قرآن وسنت نے واضح کی ہے۔ وہ جسمانی قوت کو برقرار رکھنے کے لیے غذا کا انتخاب کرتا ہے، بیماری سے بچنے کے لیے احتیاط کرتا ہے، مستقبل کی آسائش کے لیے مال جمع کرتا ہے اور اپنے بچوں کے لیے بہتر دنیا بنانے کی کوشش کرتا ہے؛ لیکن کیا وہ اپنے اعمال کی اصلاح، اپنی آخرت کی تیاری اور اپنے رب سے تعلق مضبوط کرنے کے لیے بھی اسی طرح منصوبہ بندی کرتا ہے؟

یہ سوالات کسی خاص طبقہ کے لیے نہیں، بلکہ ہر انسان کے لیے ہیں۔ ان کا مقصد دنیاوی زندگی کی اہمیت کم کرنا نہیں، بلکہ زندگی کے دونوں پہلوؤں میں توازن پیدا کرنا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زندگی کا ایسا متوازن نظام تشکیل دیں جس میں جسم کی حفاظت بھی ہو اور روح کی تربیت بھی؛ دنیا کی تعمیر بھی ہو اور آخرت کی تیاری بھی؛ اپنی ذات کی فکر بھی ہو اور دوسروں کے حقوق کا احساس بھی۔ یہی قرآن وسنت کی تعلیمات کا جامع پیغام، اسلامی تاریخ کا روشن سبق اور ایک بامقصد انسانی زندگی کا حقیقی راستہ ہے۔

☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ



محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

ذکرِ شرف

مرتب: عبد الباسط ندوی

کتاب کا پورا عنوان ''ذکرِ شرف۔ مولانا محمد شرف الدین قاسمی رحمہ اور چلمل کے دیگر اصحابِ علم وشرف'' ہے، جس کو محترم جناب مولانا عبد الباسط محمد شرف الدین ندوی نے ترتیب دیا ہے۔

مرتب موصوف مولانا عبد الباسط ندوی صاحب معہد العالی امارتِ شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ میں عرصہ سے خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء میں شمار ہوتے ہیں، اور انھوں نے مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد واضح رشید ندوی، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمان اعظمی ندوی اور دیگر مشاہیر ندوہ کی صحبت اٹھائی ہے، اور کسبِ فیض کیا ہے۔ آپ کے والدِ محترم مولانا محمد شرف الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے قابل فرزندوں میں شمار ہوتے تھے، اور علم وفضل اور سیرت و اخلاق میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اکابرِ ندوہ سے ان کی خاصی گہری وابستگی تھی، جس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے فرزندوں کو ندوۃ العلماء میں تعلیم وتربیت کے لیے بھیجا۔

مولانا محمد شرف الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ، صوبہ بہار کے بیگوسرائے کے قصبہ چلمل کے باشندہ تھے، وہ مولانا منت اللہ رحمانی کے ساتھیوں میں تھے، امارت شرعیہ بہار کے رکن تھے اور جمعیت علماء ضلع مونگیر کے ناظم۔ اس کے علاوہ وہ ایک دینی وملی رہنما اور علمی وفقہی حیثیت کے حامل شخصیت تھے۔

ایسی شخصیات کا ذکر وتذکرہ اور ان کے کوائف و احوال کا بیان بعد میں آنے والوں کے لیے یقینا مفید ہوتا ہے۔ اسی کے پیشِ نظر مولانا موصوف کے فرزندِ ارجمند جناب عبد الباسط ندوی صاحب نے ان سے متعلق جو کچھ بھی مواد دستیاب ہوسکا مرتب کر کے قابلِ اشاعت بنایا اور 'شرف میموریل ڈینٹل اورل کلینک، چلمل، بیگوسرائے' نے اس کو شائع کیا۔

مرتب نے اس کتاب میں جو مواد پیش کیا ہے، اس میں مولانا محمد شرف الدین کے مختصر حالات، اعزہ واقارب، وطنِ عزیز اور وہاں کی اہم شخصیات کا تذکرہ، مولانا کے خطوط اولاد کے نام، اکابر کے خطوط مولانا کے نام، تعزیتی خطوط وتراشے، مولانا کے مضامین جو زیادہ تر شخصیات کے تعلق سے ہیں اور دیگر اہم شخصیات کے مضامین جو مولانا کی شخصیت پر ہیں' شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب بالخصوص مولانا کی شخصیت، خاندان اور وطن کا ایک معتبر ومستند وثیقہ بن گئی ہے، جو اہلِ خاندان کے علاوہ اس علاقہ کے حالات وشخصیات سے دلچسپی رکھنے والے مؤرخین و محققین کی دلچسپی کا سامان بھی بن سکتی ہے۔

کتاب تقریبا تین صفحات کی ہے۔ طباعت عمدہ ہے۔ حصول کے لیے اس نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں:

۹۴۳۰۸۷۵۴۲۴

خصوصی شمارہ مجلہ ''تذکیر'' غازیپور

بیاد مولانا عزیز الحسن صدیقی رحمہ اللہ

غازیپور کے علمی خاندان کے چشم و چراغ، مختلف ملی و دینی اداروں اور تنظیموں سے وابستہ، بہت سے مکاتب واداروں کے بانی، مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کے رکنِ رکین اور نگہ بلند، سخن دلنواز و جاں پرسوز شخصیت مولانا عزیز الحسن صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۳ / جولائی ۲۰۲۵ء کو ہوئی تھی، بعد ازاں ان کے صاحبزادہ محترم جناب سعود الحسن ندوی نے ان کی شخصیت وخدمات پر ایک وقیع سیمینار کا انعقاد کیا تھا، جس میں ملک بھر کے دانشوران وعلماء وارباب قلم نے اپنی تحریروں اور مقالوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اب اسی سیمینار کے مضامین ومقالوں کو مرتب کر کے معروف دینی وعلمی مجلہ ''تذکیر'' کا خصوصی شمارہ ایک ضخیم جلد میں ''دینیہ اکادمی'' ماتحت مدرسہ دینیہ غازیپور نے شائع کردیا ہے۔

اس خصوصی شمارہ کی ترتیب کچھ یوں قائم کی گئی ہے کہ ابتدا میں اکابرِ امت کے تاثراتی مضامین پیش کیے گئے ہیں، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ ہے، مدرسہ دینیہ کے اساتذہ وطلبہ کا گوشہ ہے، اہلِ خانہ کی تحریریں ہیں، اور آخر میں منظوم خراجِ عقیدت ہے، اور اخبارات کے تراشے ہیں۔

اس شمارہ کی خصوصیت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں وقت کی اہم شخصیات، اربابِ علم و دانش اور اصحابِ قلم کی تحریریں اس میں موجود ہیں، جو ہر پہلو سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا احاطہ کرتی ہیں۔

مطالعہ کے خواہش مند حضرات مندرجۂ ذیل نمبرات پر رابطہ کر کے حاصل کرسکتے ہیں:

۷۰۸۱۲۲۰۶۴۰۔ ۹۴۱۵۸۸۷۵۱۳

☆☆☆

منزل بہ منزل

دوروزہ مشاورتی اجلاس مدارس ملحقہ ندوۃ العلماء

تعلیم، تربیت اور دعوت کے موضوعات پر تفصیلی مذاکرہ

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

۲۱-۲۲ اکتوبر (بروز بدھ و جمعرات) ندوۃ العلماء میں ملحقہ مدارس کا دوروزہ مشاورتی اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس میں مختلف صوبوں سے ملحقہ مدارس کے تقریباً ڈھائی سو ذمہ داران اور علماء نے شرکت کی۔ اس دوران افتتاحی واختتامی نشستوں کے علاوہ، تعلیم، تربیت اور دعوت کے موضوعات پر تین اہم مذاکرہ جاتی نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں مندوبین نے اپنی آرا، تجاویز اور تجربات پیش کیے۔ آخری نشست میں اجلاس کے حاصلِ گفتگو کو تجاویز کی شکل میں مرتب کرکے پیش کیا گیا۔

افتتاحی نشست

اس مشاعرتی اجلاس کی افتتاحی نشست تقریباً دس بجے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

حضرت مولانا نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ندوۃ العلماء کی معتدل ومتوازن فکر عصرِ حاضر میں امت کی رہنمائی کے لیے نہایت اہم ہے۔ مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ محض تعداد بڑھانے کے بجائے تعلیم وتربیت کے معیار پر توجہ دیں اور طلبہ میں علمی پختگی، فکری بصیرت اور قوتِ عمل پیدا کریں۔ مدارس کا اصل مقصد دین کی صحیح ترجمانی اور ملت کی رہنمائی کرنے والی شخصیات تیار کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اساتذہ کی تربیت، اکابر کے علمی ورثے سے وابستگی، اختلافات میں اعتدال اور عصرِ حاضر کے چیلنجوں کا حکمت وبصیرت کے ساتھ مقابلہ ضروری ہے۔

افتتاحی نشست کی نظامت مولانا کمال اختر ندوی انجام دی۔ انہوں نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ندوۃ العلماء تعلیم وتدریس، صحافت، طلبہ کی تربیت اور ادبی سرگرمیوں سمیت مختلف شعبوں میں ہمہ جہت ترقی کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ ادارے میں تعلیمی معیار کی بہتری، طلبہ کی علمی و اخلاقی تربیت، عربی وانگریزی زبانوں کے فروغ اور ہندی زبان کی تعلیم کے لیے بھی اقدامات کیے جارہے ہیں۔ اسی طرح طلبہ میں شعر وادب کا ذوق پیدا کرنے اور اکابرِ ندوہ کی علمی و ادبی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

پہلی نشست

افتتاحی نشست کے بعد اجلاس کی پہلی مشاورتی نشست تقریباً ساڑھے گیارہ بجے منعقد ہوئی، جس کا موضوع ''تعلیم'' تھا۔

اس نشست کی صدارت مولانا عمار عبدالعلی حسنی ندوی (ناظر عام ندوۃ العلماء) نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض مولانا سلمان نسیم ندوی نے انجام دی۔ مندوبین نے نصاب، تعلیمی نظام اور تدریسی معیار سے متعلق اپنی آرا پیش کیں۔

نشست میں بنیادی خطاب مولانا محمد علاء الدین ندوی نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو باطل کے مقابلے میں درپیش آزمائشوں کا سامنا حکمت اور استقامت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ انہوں نے نصابِ تعلیم کو قرآن وسنت کی روشنی میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا، تاکہ آنے والی نسلیں دینی علوم سے آراستہ ہوسکیں۔

مولانا عمار عبدالعلی حسنی ندوی مدظلہ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ طلبہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اس لیے ہر استاد کو پوری تیاری، اخلاص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ تدریس کرنی چاہیے۔ اساتذہ طلبہ کی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو سمجھیں اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے انفرادی توجہ دیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ مدارس کا مقصد صرف علم فراہم کرنا نہیں، بلکہ طلبہ کو باکردار، بااخلاق اور دین وملت کے لیے مفید انسان بنانا بھی ہے، اور اس کے لیے اگر قربانی دینی پڑے تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ہمارا یہ نظام قربانی چاہتا ہے۔

دوسری نشست

بدھ کی شب بعد نمازِ مغرب منعقد ہونے والی دوسری نشست کا موضوع ''تربیت'' تھا۔ اس نشست کی صدارت مولانا نیاز احمد ندوی (نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے کی، اور نظامت کی ذمہ داری مولانا خالد باندوی ندوی نے انجام

دی، اس میں ملحقہ مدارس کے ذمہ داران نے تربیتی مسائل اور اصلاحی اقدامات کے حوالے سے اپنی تجاویز پیش کیں۔

اس نشست میں کلیدی خطاب مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی نے کیا۔ انہوں نے علماء کے مقام و مرتبے اور ان کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ علماء کو اپنے غور و تدبر اور فکری اجتہاد کو سلفِ امت کی تعلیمات و رہنمائی کے تابع رکھنا چاہیے۔ انہوں نے شخصیت سازی کے لیے عقیدے کی درستی، حیا، قوتِ کردار، امانت داری اور عزتِ نفس کے تحفظ کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا اور ان اوصاف کو اپنی زندگی میں اپنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

صدر مجلس مولانا نیاز احمد ندوی نے اپنے خطاب میں حکیمانہ اور مشفقانہ اندازِ تربیت، موقع و محل کی مناسبت سے گفتگو اور اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی اہمیت بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ایک کامیاب مربی وہ ہے جو ان صفات کو پہلے اپنی ذات میں پیدا کرے جنہیں وہ طلبہ میں پروان چڑھانا چاہتا ہے، کیونکہ استاد کا اچھا کردار طلبہ کی اخلاقی و دینی تربیت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، نیز معاصر اساتذہ اور اہلِ علم کے درمیان باہمی احترام، حسنِ ظن اور خوش گوار تعلقات برقرار رکھنے کی تلقین کی اور غیبت، حسد، تحقیر اور غیر ضروری تنقید سے بچنے کی ضرورت پر زور دیا۔

تیسری نشست

جمعرات کی صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہونے والی تیسری نشست کا موضوع ''دعوت'' تھا جس کی صدارت مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا شیخ ابرار ندوی نے انجام دیے، مندوبین نے دعوت و تبلیغ کے طریقۂ کار، موجودہ حالات اور متعلقہ مسائل پر اپنی آرا اور تجاویز پیش کیں۔

اس نشست میں خصوصی خطاب مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی نے کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ دعوتِ دین کے لیے اخلاص، حکمت اور عملی جدوجہد ضروری ہے۔ علماء عصرِ حاضر کے مسائل اور معاشرتی ضروریات کو سمجھتے ہوئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل پیش کریں۔ انہوں نے دینی و معاشرتی زندگی میں شریعت کی رہنمائی، علماء کے باہمی اتحاد اور مجلسِ مشاورت کی اہمیت پر بھی زور دیا۔

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی نے اپنے صدارتی خطاب میں دعوت و تبلیغ میں مخاطب کے فہم اور حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکمت، اعتدال اور نرمی اختیار کرنے کی اہمیت بیان کی۔ انہوں نے ذاتی تربیت، اولاد اور ماتحتوں کی اصلاح پر توجہ دینے اور دین کی خدمت اخلاص، محبت اور محنت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انجام دینے کی تلقین کی۔

اختتامی نشست

اجلاس کی آخری نشست جمعرات کو صبح ساڑھے گیارہ بجے منعقد ہوئی، جس کی نظامت مولانا اصطفاء الحسن ندوی نے کی۔ اس موقع پر مولانا محمد نفیس خان ندوی نے دو روزہ اجلاس میں پیش کی گئیں آرا، مشوروں اور تجاویز کو مرتب کر کے اجلاس کی تجاویز کے طور پر پیش کیا۔

بعد ازاں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی نے اہم خطاب کیا۔ انہوں نے پیش کردہ تجاویز پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے ان کی افادیت اور عملی نفاذ کی اہمیت واضح کی اور مستقبل کے لائحۂ عمل پر زور دیا۔ اجلاس کا مجموعی پیغام یہ تھا کہ ملحقہ مدارس میں تعلیمی معیار کی بہتری، اساتذہ کی تربیت، طلبہ کی اخلاقی و فکری تعمیر اور دعوتی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے باہمی مشاورت اور عملی اقدامات کو ترجیح دی جائے، تاکہ مدارس اپنے بنیادی مقصد کے مطابق دین و ملت کی مؤثر رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

اس آخری نشست کی صدارت حضرت مولانا محمد زکریا سنبھلی مدظلہ نے کی، انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ شیطان اور اس کی پیروی کرنے والی باطل قوتیں ہر دور میں دین سے دور کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں، اس لیے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکمت، اخلاص اور استقامت کے ساتھ اسلام کی حفاظت اور دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیں۔ انہوں نے زور دیا کہ باطل نظریات کا مقابلہ علمی و دعوتی جدوجہد کے ذریعے کیا جائے اور مسلمانوں کو دین کی بنیادی تعلیمات سے واقف کرایا جائے۔ انہوں نے اساتذہ کو طلبہ کی دینی، اخلاقی اور علمی تربیت، مطالعے کا شوق پیدا کرنے اور موبائل فون کے مضر استعمال سے بچانے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ مدارس تعداد بڑھانے کے بجائے معیارِ تعلیم و تربیت بلند کریں اور ندوۃ العلماء سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھتے ہوئے ایسے طلبہ تیار کریں جو دین و ملت کی مؤثر خدمت کر سکیں۔

اس پروگرام میں قاری بدرالدجی فرقانی صاحب اور عبداللہ ماجد نے تلاوت کی، محمد کیف اور ان کے رفقاء نے ترانہ ندوہ پیش کیا جبکہ عزیز الرحمن، حذیفہ رحمت، محمد صفوان اور محمد گلاب نے مختلف موقعوں پر نعتیں اور نظمیں پیش کیں۔

☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۲۵ راکتوبر ۲۰۲۶ء

Date 25th October 2026

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا) عبدالعزیز خلیفہ بھٹکلی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں:
Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا